حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی و ادبی ماہنامہ

سب رس

نومبر 2017ء

30/-روپے

ISSN-2278-6902

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس اے شکور ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کاروان ادب اور اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹ اسوسی ایشن کے زیر اہتمام بچوں کے ادب پر منعقدہ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب فاروق سید ایڈیٹر گل بوٹے ممبئی' پروفیسر اشرف رفیع' جناب سید محمد افتخار مشرف' جناب عابد صدیقی' محترمہ شبینہ فرشوری و دیگر دیکھے جاسکتے ہیں

اسکول آف ہیومانیٹیز و شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ راجہ دھن راج گیر جی یادگار خطبہ "اقبال اور ہندوستان" ماہر اقبالیات جناب مظفر شہ میری نے پیش کیا۔ محترمہ رانی اندرا دیوی دھن راج گیر جی، جناب مجتبیٰ حسین، پروفیسر بنیان موتی (ڈین اسکول آف ہیومانیٹیز) اور پروفیسر حبیب نثار (صدر شعبہ اردو) دیکھے جاسکتے ہیں۔

بنیاد گزار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۷۹ — شمارہ: ۱۱ — ماہ: نومبر — سال: ۲۰۱۷ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

قیمت: 30/-

زرِ سالانہ

❁ ہندوستان: **300** روپے

❁ کتب خانوں سے: **400** روپے

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے

❁ مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 — **Editor: 9849256723** — Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد 500 082. انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور نے طہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ
کلونجی
زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کر رہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔
خواتین کا من پسند اور آزمودہ نسخہ
زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفا دور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دوماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔
کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔
کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔
کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑ، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے
آپ بھی آزما کر دیکھئے
ہمارے دیگر پراڈکٹس
• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز
حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔
®
Mfg. Lic. No. 327/DU/98
KALONJI OIL
KALONJI CHYAWANPRASH
KALONJI MISWAK
Herbal Tooth Powder
KALONJI FAIRNESS CREAM
KALONJI HERBAL PIMPLE CREAM
ZAM ZAM-E-BAHAR HAIR OIL
MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)
MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091
ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

درس گاہوں کی صورت حال — بیگ احساس — 06

مضامین

نواب شاہ عالم خاں کی یاد میں — مجتبیٰ حسین — 08

اماوس میں خواب..... ایک تحریری دستاویز — عبدالصمد — 11

وہ کاغذ کی کشتی، وہ بارش کا پانی (عہدِ طفلی کا ادب) — اسیم کاویانی — 16

مابعد جدیدیت، نئی فکریات اور بنیادی تبدیلیاں — وسیم بیگم — 28

مولانا آزاد کی شعری بصیرت ''غبار خاطر'' کے آئینہ میں — شاہد نوخیز اعظمی — 39

آپ بیتی

یادیں — راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر / اشرف رفیع — 43

سفرنامہ

آوارگی تھوڑی سی (دوسری قسط) — مہتاب قدر — 47

طنزومزاح

جانِ عالم کا پری خانہ اور ریڈیو پاکستان — خامہ بگوش — 57

افسانے

بعید از قیاس — اشتیاق سعید — 61

نجات — علی نثار — 70

شاعری

کوثر صدیقی، احسن رضوی، مسلم نواز، نصر شاہی برہانپوری — اختر شاہجہاپوری، احمد نثار، مقصود احمد انصاری، حنیف ساحل — 74

جو وہ لکھیں گے جواب میں

خطوط — کوثر صدیقی، ڈاکٹر محمود شیخ، الطاف انجم — 79

اداریہ

درس گاہوں کی صورت حال......

آزادی سے قبل سرکاری مدارس تمام سہولتوں سے آراستہ ہوتے تھے اور تقریباً طبقات بشمول اونچے متوسط طبقے کے بچے سرکاری مدارس ہی میں پڑھا کرتے تھے۔ کچھ مشنری اسکول اور کچھ جاگیرداروں کے مخصوص اسکول تھے لیکن سرکاری اسکولوں کا معیار انتہائی بلند اور اطمینان بخش ہوا کرتا تھا۔ انگریز گئے جمہوریت آئی، ریاستوں سے بادشاہت ختم ہوئی تو اسکولوں کا معیار دن بہ دن زوال پذیر ہونے لگا۔ ادھر حکومت نے خانگی مدارس کی حوصلہ افزائی کی۔ کوئی بھی شخص خانگی اسکول کھول سکتا ہے۔ اگر وہ حکومت سے منظور شدہ نہ ہو تب دوسرے مدارس سے اپنے طلبہ کو امتحان دلواتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خانگی مدارس ایک بڑی انڈسٹری بن گئے۔ اشتہار بازی، نتائج کے اعداد و شمار کی بنیاد پر اسکولوں کا کاروبار چلنے لگا۔ سرکاری مدارس میں خستہ حال عمارتیں، اسکول کے لیے دوسری بنیادی اشیا اور انفراسٹرکچر کی کمی نے نچلے متوسط درجے کے عوام کو بھی سرکاری اسکولوں سے دور کر دیا۔ اساتذہ کے وقت پر تقرررات کا نہ ہونا متعلقہ مضمون کا استاد دستیاب نہ ہونا اساتذہ کا اسکولوں کو آرام گاہ تصور کرنا۔ فرائض کی عدم تکمیل ایسی خرابیاں ہیں جو ایک کھلا راز ہے۔ اس کے سدباب کی کوششیں نہیں کی جاتیں۔ ماں باپ اپنے بچوں کے سنہرے مستقبل کے خواب سجائے لاکھوں روپیہ داخلے اور فیس پر خرچ کرتے ہیں آج خانگی مدارس کئی منزلہ عمارتوں میں کام کر رہے ہیں۔ نہ کھیلنے کے لیے کوئی گراؤنڈ ہے اور نہ فزیکل ایجوکیشن کی کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ان مدرسوں کے انتظامیہ میں کڑوڑ پتی لوگ شامل ہیں جو تعلیم کو تجارت تصور کر کے پیسہ کما رہے ہیں۔ اساتذہ کو بہت کم تنخواہ میں دی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ زرخرید غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ چھٹیوں میں ان اساتذہ کو ٹارگٹ دیا جاتا ہے کہ وہ اس کے مطابق طلبہ کا داخلہ کروائیں۔ ورنہ ان کی ملازمت کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اساتذہ پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ اب اپنی ملازمت بچانے کی خاطر اساتذہ بچوں کو راغب کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرتے ہیں۔ دولت مند بچے استاذہ کی بالکل تعظیم نہیں کرتے۔ انھیں طرح طرح کے ناموں سے چڑاتے ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود یہ مدارس اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ تھوڑے تھوڑے دنوں بعد اسکولوں میں کسی نہ کسی حادثے کی المناک خبریں ملتی ہیں۔ ماں باپ لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بھی اپنے بچوں کو کھو دیتے ہیں۔ کچھ دن پہلے ایک اسکول کی لفٹ میں لڑکی اس بُری طرح پھنس گئی تھی کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ کچھ دن یہ واقعہ خبروں میں رہا اس کے بعد کیا ہوا کچھ پتہ نہیں۔ اکثر انتظامیہ پولیس کو ہموار کر لیتا ہے۔ حال میں شہر کے ایک مشہور اسکول میں سکیوریٹی گارڈ ایک لڑکی کا ریپ کر دیا۔ اب محافظ ہی اسی طرح حرکتیں کریں تو کس پر بھروسہ کیا جائے۔ ہائی اسکول اور جونئر کالجس کے طلبہ عمر کے خطرناک دور سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ اکثر طلبہ اسمارٹ فونس کی کرامتوں سے وقت سے پہلے ذہنی طور پر بالغ ہو جاتے ہیں۔

جونیئر کالج اور دسویں، گیارہویں کے طلبہ کو اپنی خاتون استاد کی تصویریں لیتے اور انھیں فیس بک پر اپ لوڈ کرتے دیکھا گیا۔ کم سن بچے اور دسویں گیارہویں کے بچے ایک ساتھ اسکول میں ہوں تو کم سن بچوں کی سخت حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ابھی گرگاؤں کے ایک اسکول میں دوسری جماعت کے طالب علم پر دھومن کا قتل ہوگیا۔ اسکول میں C.C.T.V. کیمرے ہیں۔ محافظین ہیں اس کے باوجود ایک معصوم لڑکے کا قتل ہوگیا۔ سی بی آئی اپنے طریقے سے اس کیس کی تفتیش کر رہی ہے۔ پہلے تو بس کنڈکٹر پر شبہ کیا گیا۔ اس پر تھرڈ ڈگری کا استعمال کر کے اقبال جرم کروالیا گیا۔ بعد میں اس نے اس جرم سے انکار کر دیا۔ کچھ دن بعد خبر آئی کہ یہ قتل گیارہویں جماعت کے طالب علم نے کیا۔ ایک روز قبل اس نے چاقو خریدا تھا۔ اس لڑکے سے بھی اقبال جرم کروالیا گیا کہ اصل میں وہ لڑکا Parents Teachers Meeting ملتوی کروانا چاہتا تھا اس لیے اس نے یہ جرم کیا۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ امتحانات ملتوی کروانا چاہتا تھا۔ لڑکے کو عدالتی تحویل میں دے دیا گیا اب یہ بات زیر بحث ہے کہ اس پر بالغوں کی عدالت میں کیس چلایا جائے یا نابالغ قرار دیا جائے۔ اصل مسئلہ کیا ہے وہ پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آیا۔ اسکول کے CCTV کیمرے اور محافظ اسٹاف کہاں تھا اور کیوں کیمرے کام نہیں کر رہے تھے یہ سوال اسکول انتظامیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ تازہ خبر ہے کہ اسکول دوبارہ کھل گیا۔ ایک معصوم لڑکے کی جان گئی۔ ایک لڑکا جس پر قاتل ہونے کا الزام ہے اگر اس نے قتل نہیں کیا ہے تو اس کی زندگی بھی برباد ہو جائے گی۔ اسکول جو لاکھوں روپیہ ڈونیشن لیتے ہیں بچوں کی حفاظت کرنے میں یکسر ناکام ہیں۔ اسکولوں کا انتظامیہ دولت مند طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ کچھ دن بعد لوگ سب بھول جاتے ہیں۔ حکومت کو اس بارے میں سنجیدگی سے کچھ قواعد اور ضوابط بنانے چاہیے۔ خاطیوں کو سخت سزا دینی چاہیے تاکہ اس طرح کے واقعات دوبارہ نہ ہوں۔

☆☆☆

جناب چندر شیکھر راؤ اقلیتوں کے مسائل حل کرنے میں سنجیدہ ہیں۔ انھوں نے وقف بورڈ کے دفاتر کو مہر بند کر کے ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا ہے۔ جب تک احتساب کا خوف نہ ہوگا عہدہ دار من مانی کریں گے۔ دوسری طرف انھوں نے اسمبلی میں اعلان کیا کہ وہ ہر محکمے میں اردو مترجم کا تقرر کریں گے۔ یہ بھی خوش آئند بات ہے۔ محکمہ اقلیتی بہبود کی جو ٹیم اس وقت کام کر رہی ہے وہ ایماندار اور ذمہ دار ہے۔ یہ عہدہ دار چیف منسٹر کی سونپی ہوئی ہر ذمہ داری کو پوری جاں فشانی سے نبھا رہے ہیں۔ بعض عہدہ دار رات دن کام میں مصروف رہتے ہیں۔ بمشکل تین چار گھنٹے وہ رات میں سو سکتے ہیں۔ چیف منسٹر صاحب بھی مردم شناس ہیں اور ایسے عہدہ داروں پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ حکومت کی جانب سے ڈاکٹر حیدر خاں کو ابوالکلام آزاد ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ وہ یقیناً اس کے حق دار ہیں۔ افسانہ نگار محترمہ عاصمہ خلیل کا انتقال ہوگیا۔ ادارہ ان کے حق میں مغفرت کی دعا کرتا ہے۔

بیگ احساس

خراج عقیدت

مجتبیٰ حسین

نواب شاہ عالم خاں کی یاد میں

پچھلے دنوں نواب شاہ عالم خاں اپنے چاہنے والوں کے سروں پر سے اچانک اپنا سایہ اُٹھا کر عالم بالا کی طرف نکل گئے۔ یہ تک نہ سوچا کہ ان کا سایہ اُٹھ جانے سے اُن کے چاہنے والے، زمانہ کی تمازتوں کو کیونکر برداشت کریں گے۔

موت سے کس کو رُستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

وہ محبتوں، شفقتوں اور عنایتوں کا سمندر تھے، جو کوئی بھی ملتا اُسے اپنی محبتوں اور شفقتوں سے سرشار کر دیتے تھے۔ لگ بھگ دو مہینے پہلے جب نواب صاحب کو اسپتال میں شریک کرایا گیا تو مجھے یقین تھا کہ نواب صاحب حسب سابق ہفتہ دس دن میں اپنی توانا خواہشِ زیست کے سہارے اور اپنی مضبوط قوت ارادی کے بل بوتے پر صحت یاب ہو کر جلد ہی گھر واپس ہو جائیں گے۔ کبھی کبھار وہ اسپتال چلے جاتے تو ضروری طبی معائنوں کے بعد چند ہی دنوں میں گھر واپس آ جاتے تھے۔ اس بار ان کے گھر واپس ہونے میں تاخیر ہونے لگی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ ان کے فرزندوں قادر عالم خان اور احمد عالم خان کو فون کر کے روز ہی نواب صاحب کی کیفیت دریافت کر لیتا تھا۔ پتہ چلا کہ خیریت سے تو ہیں، البتہ انہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے جس کی وجہ سے کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سارے عرصہ میں صرف دو بار نواب صاحب سے بات ہوئی، وہ بھی چند سیکنڈوں کیلئے۔ ان کی آواز اتنی نحیف و نزار ہو گئی تھی کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ وہ اس نحیف و نزار آواز میں بھی یقیناً مجھے دعاؤں سے سرفراز کر رہے ہوں گے۔ ان کی عادت تھی کہ چھوٹوں سے جب بھی ملتے یا بات کرتے تو دعاؤں کی بوچھاڑ لگا دیتے تھے اور دلچسپ بات یہ تھی کہ ان کی اکثر دعائیں قبول بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ جیسا گنہگار بے اعتدالیوں اور انگنت بدنظمیوں کے باوجود اتنی لمبی عمر کیسے پاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اوپر والے کے کرم سے اور نواب صاحب کی دعاؤں کے طفیل میں اب تک زندہ رہتا چلا آ رہا ہوں، ورنہ ضمیر کہتا ہے کہ مجھے تو پچاس برس پہلے ہی مر جانا چاہئے تھا۔

نواب صاحب سے میرے شخصی مراسم نصف صدی پرانے تھے اور یہ مراسم بھی طنز و مزاح میں نواب صاحب کی گہری دلچسپی کے باعث رہے ہیں۔ میں نے 1962ء میں محض اتفاقاً مزاحیہ کالم نگاری شروع کی تھی۔ میری ہی تجویز پر مئی 1966ء میں حیدرآباد میں طنز و مزاح کی یادگار کُل ہند کانفرنس زندہ دلان حیدرآباد اور حلقہ ارباب ذوق کے تعاون سے منعقد ہوئی تھی جس کے چرچے سارے ملک میں ہوئے۔ اس وقت تک نواب شاہ عالم خاں سے میرے شخصی مراسم قائم نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ میرے ناقابل علاج مدّاح تھے اور میں حسب توفیق ان کے زیر علاج رہتا تھا۔ نواب شاہ عالم خاں ان کے گہرے دوستوں میں تھے۔ ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی کے ساتھ ہی میری ملاقات نواب صاحب سے ہوئی تھی۔ اگست 1967ء میں جب حلقہ ارباب ذوق نے حیدرآباد میں جشن مزاح کے انعقاد کا اہتمام کیا تو اس میں راجندر سنگھ بیدی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فکر تونسوی، اور دلاور فگار کے علاوہ دکن کے سارے اہم شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ حکومت ہند کے اس وقت

کے سکریٹری دفاع جناب وی شنکر آئی اے ایس نے اس جشن کا افتتاح کیا تھا۔ بھارت چندکھنداس جشن کے صدر تھے اور میں اس کا معتمد تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس موقع پر لطیفہ گوئی کی ایک محفل بھی منعقد کی جائے ۔ یوں بھی اس محفل میں دو سردار آ رہے تھے ۔ یہ بات جب نواب شاہ عالم خاں تک پہنچی تو انہوں نے بتایا کہ ہمالیہ ڈرگ کمپنی کے مالک ایم ۔منال صاحب ان کے دوستوں میں ہیں اور وہ شوقیہ طور پر بہت پُر لطف انداز میں لطیفے بھی سناتے ہیں ۔ چنانچہ نواب صاحب کی سفارش پر ایم ۔منال نے اس جشن میں شرکت کی اور ایسے لطیفے سنائے کہ گاندھی بھون کا ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا۔ میں نے بعد کی زندگی میں کبھی لطیفہ گوئی کی ایسی کامیاب محفل میں شرکت نہیں کی ۔ یوں نواب شاہ عالم خاں مزاح نگاروں کے سرپرست بن گئے ۔ان کا ایک شخصی احسان مجھ پر یہ بھی ہے کہ 1968ء میں میری پہلی کتاب ''تکلف برطرف''انہوں نے اپنے صرفہ سے چھپوائی ۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ میری اس پہلی کتاب کو جو مقبولیت عطا ہوئی وہ کسی اور کتاب کے حصہ میں نہ آئی ۔ چنانچہ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے ایک ہزار نسخے صرف تین مہینوں میں فروخت ہوگئے ۔فوراً دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا ۔ زندہ دلان حیدرآباد کے ادبی اجلاسوں میں جب میں کوئی مضمون سناتا تھا تو اس کے سامعین میں میرے پانچ کرم فرما عابد علی خان، محبوب حسین جگر، ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی، نواب شاہ عالم خاں اور ڈاکٹر سید عبدالمنان سامنے کی صفوں میں ضرور موجود ہوتے تھے ۔وہ عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کے طالب علمی کے زمانہ کے دوست تھے۔

نواب شاہ عالم خاں نہایت وجیہہ وشکیل شخصیت کے مالک ہونے کے علاوہ نہایت خوش لباس، دلنواز اور جامہ زیب واقع ہوئے تھے۔کوئی بھی لباس پہن لیتے تو وہ ان پر خوب نکھرتا اور سجتا تھا ۔ میں اکثر مذاق میں کہا کرتا تھا کہ اگر نواب صاحب گاندھی جی کا شہرہ آفاق لباس بھی پہن لیں تو بھلے ہی وہ جامہ زیب نہ لگیں بیحد دیدہ زیب تو ضرور دکھائی دیں گے۔شیروانی پہنتے تو رومی ٹوپی ضرور پہنتے تھے ۔ پھولوں کے اور وہ بھی گلاب کے بیحد شوقین تھے، کبھی کبھی اپنے سوٹ کے کالر پر یا شیروانی کے کاج میں گلاب کا خوشنما پھول بھی ٹانک لیتے تھے ۔ وہ برسوں عالمی روز سوسائٹی (Rose Society) کے صدر نشین بھی رہے۔ان کا قد بھی ایسا اونچا پورا تھا کہ کسی بھی محفل میں جاتے تو سب سے مختلف اور نمایاں نظر آتے تھے ۔انہیں مسلمانوں کی تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی ۔ چنانچہ برسوں وہ انوارالعلوم ایجوکیشن سوسائٹی اور نواب شاہ عالم خان انجنیئر نگ کالج کے سربراہ رہے ۔ 2004ء میں جب انوارالعلوم ایجوکیشن سوسائٹی کی گولڈن جوبلی منائی گئی تو انہوں نے ازراہ عنایت مجھے اس کی مشاورتی کمیٹی کا رکن بنایا۔

ان کا حسن سلوک خالص حیدرآبادی ہوتا تھا ۔ وہ حیدرآبادی تہذیب کے نہ صرف پروردہ تھے بلکہ اس کے امین بھی تھے ۔ میں جب بھی ان سے ملنے کیلئے جاتا تو وہ فوراً اُٹھ کر کھڑے ہوجاتے تھے اور خالص حیدرآبادی انداز میں جھک کر دو چار سلام کرتے تھے اور میں جب جانے لگتا تو میرے منع کرنے کے باوجود باہر تک چھوڑنے ضرور آتے تھے ۔ یہ وضع داری، یہ رکھ رکھاؤ، یہ سلیقہ، یہ رچاؤ اب کہاں دیکھنے کو ملے گا ۔ وہ جہاں حیدرآبادی تہذیب کی نشانی تھے وہیں وہ انگریزی تہذیب اور آداب کے پاسدار بھی تھے ۔ان کی تعلیم انگریزی مدرسوں میں ہوئی تھی اور وہ بہترین انگریزی بولتے تھے ۔ وہ اکثر اپنے انگریز اساتذہ کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے تھے ۔ وہ جو بھی کام کرتے تھے نہایت خلوص اور لگن

کے ساتھ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی نوجوانی میں گولکنڈہ سگریٹ فیکٹری کے استحکام کیلئے انتھک محنت کی۔ اسی محنت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنی ایک الگ امپائر قائم کرلی تھی۔ اگرچہ بعد میں ان کے لائق فرزندوں نے کام سنبھال لیا تھا مگر وہ آخر تک ہر روز تیار ہوکر اپنے دفتر ضرور جایا کرتے تھے اور ڈسپلن کی پابندی کرتے تھے۔ اب انہیں یاد کرنے بیٹھا ہوں تو ان کے حسن سلوک کی کتنی ہی باتیں یاد آنے لگی ہیں۔ 2007ء میں جب حکومت ہند نے مجھے پدم شری کے اعزاز سے نوازا تو نواب صاحب مجھے مبارکباد دینے کیلئے بہ نفس نفیس میرے غریب خانہ پر تشریف لے آئے۔ اُن دنوں میرا ''غریب خانہ'' اے سی گارڈس کی ایک بلڈنگ کی پانچویں منزل پر واقع تھا۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے کہا ''نواب صاحب آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں گوارا کی میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتا'' ۔ ہنستے ہوئے مجھے اپنے سینہ سے لگایا اور کہا ''میاں مجتبٰی! اگر یہ خطاب تمہیں میر عثمان علی خاں کے دور میں ملتا تو آج تم ''مجتبٰی یار جنگ'' کہلائے جاتے۔ پھر بولے یاد رکھو تمہیں پدم شری ملنے کی پہلی تہنیتی تقریب میرے گھر پر منعقد ہوگی۔ چنانچہ ایک ہفتہ بعد انہوں نے میرے لئے ایک شاندار تقریب اپنے گھر پر رکھی جس میں انہوں نے حیدرآباد کے کئی باذوق اور بارسوخ اصحاب کو مدعو کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے مجھے ایک ایسی گھڑی بھی تحفہ میں دی جس کی قیمت ان دنوں ایک لاکھ روپئے سے زیادہ تھی۔ میں نے عرض کیا ''نواب صاحب! یہ گھڑی مجھ سے زیادہ قیمتی ہے' میں بھلا اپنا وقت ضائع کرنے کیلئے اسے کیونکر استعمال کرسکتا ہوں'' ۔ اس بات پر زوردار قہقہہ لگایا۔ میرے بعض خاص احباب جب بھی باہر سے آتے تو وہ بڑے اہتمام سے انہیں اپنے گھر پر مدعو کرتے تھے۔

نواب صاحب کی کتنی باتوں کو یاد کروں۔ میں اپنے بارے میں اتنا فکرمند نہیں رہتا تھا جتنا کہ نواب صاحب میرے لئے فکرمند رہا کرتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ تمہیں کوئی پریشانی ہو تو بلاتکلف مجھ سے کہو۔ اور میں ان سے کہتا تھا کہ ''نواب صاحب! آپ کا جو حسن سلوک میرے ساتھ ہے اس کی مالیت میرے لئے کروڑوں روپیوں سے زیادہ ہے' مجھے اور کیا چاہئے'' ۔ ایک بار میری صحت کے تعلق سے فکرمند ہوئے تو امراض شکم کے (Asian Institute of Gastro Entrology) کے ڈاکٹر ناگیشور ریڈی سے کہا کہ وہ میرے سارے طبی معائنے کرائیں اور میرا علاج کریں۔ میں نے نواب صاحب سے دست بستہ عرض کی کہ حضور میں نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ امریکہ کے کئی دواخانوں میں پیٹ کے کئی تفصیلی معائنے کروائے ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ میرا پیٹ میری جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کے تابع ہے۔ لہذا خوش رہا کرو'' ۔

نواب صاحب کا حافظہ غضب کا تھا۔ برسوں پرانی باتیں ان کے حافظہ میں تر و تازہ رہتی تھیں۔ روزنامہ ''سیاست'' میں جب ''حیدرآباد جو کل تھا'' کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ ہر ہفتہ چھپنے والی شخصیت کے بارے میں مجھ سے تفصیلی باتیں کرتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ گذشتہ حیدرآباد کے بارے میں ان کا مشاہدہ کتنا وسیع اور عمیق ہے۔ حیدرآباد کے کئی امراء اور روسا کے افراد خاندان کو وہ شخصی طور پر جانتے تھے اور یوں وہ حیدرآبادی تہذیب کی روشن قدروں اور ان کی باریکیوں سے کما حقہٗ آشنا تھے۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ نواب صاحب گذشتہ حیدرآباد کی آخری نشانی تھے۔

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

OOO

عبد الصمد

مضمون

اماوس میں خواب..... ایک تحریری دستاویز

حسین الحق کے نئے ناول ''اماوس میں خواب'' پر گفتگو کی ابتدا میں بالزاک کے اس قول سے کرنا چاہتا ہوں کہ فکشن بنیادی طور پر کسی قوم کی مخفی تاریخ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فکشن تاریخ سے زیادہ مضبوط اور پر اثر میڈم ہے۔ ''اماوس میں خواب'' اس کی زندہ مثال ہے، جس میں ہندوستان کے پچھلے تقریباً چالیس سال کے معاشرتی اور سیاسی پس منظر کو کامیابی کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور اس کے ساتھ تقسیم ملک کو اب ستر سال ہوئے۔ اس عرصے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تقسیم تو 1947ء میں ہوئی، دوسری 1971ء میں جب پاکستان کا ایک بڑا حصہ ایک الگ ملک کی شکل وجود میں آ گیا۔ اس کو برصغیر ہند کی تقسیم کہنا زیادہ بہتر ہوگا، یعنی ان ستر برسوں میں برصغیر کی دو تقسیم تھوڑے تھوڑے وقفے سے عمل میں آئی۔ بھولنا نہیں چاہیے کہ قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں یہ وقفہ کوئی بڑا عرصہ نہیں مانا جاتا۔ یہ تو زمین کی تقسیم کی بات ہوئی مگر جو ہر لحظہ سماجی، معاشرتی اور سیاسی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا وہ آج ایک خطرناک شدت اختیار کر چکا ہے۔ اس کا لیکھا جوکھا فکشن نگار ہی کے قلم سے ادا ہو سکتا تھا۔ جو ''اماوس میں خواب'' میں بخوبی ادا ہوا ہے۔ ناول نگار حسین الحق نے اپنی اس نسل کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو نسل نہ صرف اس بے حد پرشور، ہنگامہ خیز اور دردناک وقتوں کی گواہ رہی ہے بلکہ اس نے ان تمام مصیبتوں کو ہر طرح سے جھیلا ہے اور اب بھی بھوگ رہی ہے، اور نہ جانے ابھی آگے کتنا عرصہ اسے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دیر سویر یہ نسل تو معدوم ہو ہی جائے گی مگر یقیناً اپنی سوچ، اپنی آنکھیں، اپنا شعور اور اپنا قلم آنے والی نسلوں کو سونپ جائے گی، بقیہ قصہ آنے والے لوگ ہی رقم کریں گے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ حسین الحق نے کوئی نیا، انوکھا اور دلچسپ قصہ سنایا ہے۔ قصہ تو وہی ہے جو بہت بار سنا اور دیکھا جا چکا ہے۔ قصہ گوئی میں سب سے اہم کردار خود قصہ گو کا ہوتا ہے۔ یہ قصہ ایک صاحب قلم فکشن نگار نے سنایا ہے، اس لیے اس میں ایک خاص بات ضرور ہے جو دوسرے قصوں سے اسے علاحدہ اور ممتاز کرتی ہے۔

بہار کا ایک خاندان چند نا گزیر حالات کے سبب یہاں سے ہجرت کر کے مہاراشٹرا کے اس وقت کے ایک چھوٹے سے شہر مالے گاؤں میں جا بستا ہے۔ دراصل اس خاندان کا اپنے لوگوں اور اپنے وطن سے دل اس قدر ٹوٹ چکا ہے کہ وہ اپنے طور پر ایک دور دراز اور انجان علاقے کو اپنا وطن ثانی بنا لیتا ہے۔ وہاں کی زندگی اور ماحول میں وہ رچ بس جاتا ہے حسب معمول زندگی کے ساری لوازمات، ضروریات اور فرائض پورے ہوتے رہتے ہیں، روزی روٹی، گھر بار، شادی بیاہ، بال بچے اس خاندان نے کوئی اونچے خواب نہیں بُنے تھے لہٰذا جو کچھ حاصل ہو سکا، اسی کو اس نے حاصل زندگی سمجھ لیا اور گاڑی جس دھیمی رفتار سے شروع ہوئی تھی، اسی رفتار سے رواں دواں رہی، نہ کوئی اتھل پتھل، نہ کوئی چمک، نہ کوئی چمتکار.....

مگر ہوتا یہ ہے کہ سامنے موجود خوشنما پردے کے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا، اس لیے انسان اس سے بے خبر اور خوش رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ خوش نما پردے میں جو کچھ چھپا ہوتا ہے وہ ہے تو بہت پرانا مگر ہر بار نیا لگتا۔ فساد کی چنگاری کیسے بھڑکی، یہ کوئی نئی اور

خاص بات نہیں، مگر اس چنگاری میں اتنی طاقت تھی کہ اس نے ایک بار پھر زمین سے لے کر آسمان تک شعلوں کی ایک بارات سجا دی۔ ان شعلوں نے جہاں ایک دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا وہاں اس خاندان کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی، سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا، بس ایک فرد جس کی قسمت میں ابھی بہت شعلوں کو دیکھنا تھا، بچ گیا اور کسی طرح بچ بچا کے خوابوں کی ایک وادی میں جا نکلا، اسے فی الحال صرف سکون کی تلاش تھی۔ سکون تو میسر ہونے کے آثار نمایاں ہوئے لیکن اندر اندر بے سکونی کی جو ایک مشین لگی تھی، اس کی رفتار بڑھتی ہی جاتی تھی۔ ناول کا مرکزی کردار سکون کی تلاش میں جس مقام پر جا پہنچا اس مقام سے ناول نگار کما حقہ واقف ہے اور اس کا پس منظر بھی تقریباً یہی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ یہاں اس نے معروضیت سے کام لیا ہے۔ ان کا کردار سکون حاصل کرنے میں گویا ناکام رہا۔ وہ اب اپنی بنیادوں (Roots) کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ بھٹکتا ہوا وہ جس مقام پر جا پہنچا تھا وہاں سکون حاصل کرنے کے سارے راستے معدوم تھے۔ اصل میں وہ جس بے چینی اور انتشار کا شکار تھا وہ اسے کہیں ٹکنے نہیں دیتی تھیں۔ آخر جذبات اور حالات کے تیز بہاؤ میں وہ ایک تنکے کی طرح بہتا ہوا ایک ایسے رشتہ دار کے ہاں پہنچ جاتا ہے جس سے اس کا رشتہ تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔ ناول نگار کا حسن ظن یا ذاتی تجربہ ہے کہ یہاں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابھی رشتوں کی ڈوری اتنی کمزور نہیں ہوئی۔ زمان و مکان میں مقید اس قصے میں رشتے کی یہ آخری مضبوط کڑی تھی۔ اپنی بنیادوں میں پہنچ کر کردار کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پیر پھر اس زمین پر جم گئے ہیں جس کی طنابیں کھینچی جا چکی تھیں۔ زندگی پھر ایک نئے سرے سے اپنی شروعات کرتی ہے۔ تنکا تنکا کر کے آشیانے کی پھر تعمیر، رشتوں کی الجھی ہوئی ڈور کا دھیرے دھیرے سلجھتے جانا، ماضی کے ملبے پر پھر یک نئی عمارت کا کھڑا ہونا، زندگی کا وہ چہرہ پھر سامنے آنا جو اپنی معنویت کھو چکا تھا، گرد کی موٹی تہہ جس پر جم گئی تھی۔ بارے کالے بادل چھٹ گئے اور سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ زندگی کرنے کے وہ تمام بہانے اور ضروریات حاصل کرنے کی تگ و دو شروع ہو گئی۔ دراصل پچیس تیس برسوں کا یہ عرصہ ملک کی تاریخ کا اہم ترین اور معنی خیز حصہ ہے جس کے روح کی گواہی ناول نگار نے دینے کی کوشش کی ہے۔ اس عرصے کا ایک ایک لمحہ برسوں کے برابر ہے، جس تیزی سے سیاسی اور معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں، قدروں کا جوز بردست زوال ہوا، مضبوط بنیادیں اکھڑ گئیں، سارے اصول وضوابط کی دھجیاں اڑ گئیں، انسان انسان میں تفریق پیدا ہوا۔ جانور اور انسان میں زیادہ فرق نہیں رہا، بلکہ کہیں کہیں تو جانوروں کی قدر و منزلت انسان سے برتر ثابت ہوئی، اور بھی بہت سی تبدیلیاں اور نشیب و فراز..... ان سب کو فکشن کی صورت سمیٹنا آسان نہیں تھا۔ ناول نگار کافی حد تک اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہوا ہے۔ اس نے ایک فکشن نگار کے منصب کو کامیابی کیساتھ پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ناول نگار کی منصبی زندگی درس و تدریس سے متعلق رہی ہے۔ اس نے بہت باریکی سے اس مسئلے کی پیچیدگیوں بلکہ اس کے زوال کو دیکھا ہے۔ اس موضوع پر بہت قبل اس کا ایک ناول ''بولو مت چپ رہو'' آ چکا ہے۔ مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تبدیلیوں کے بدلنے کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ آج کی بات کل پرانی ہو جاتی ہے۔ ''بولو مت چپ رہو'' کی اشاعت کے بعد سے تعلیمی نظام میں آسمان و زمین کا فرق آ چکا ہے۔ ناول نگار کو بھی اس کا شدت سے احساس ہے۔ چناں چہ اس نے اس ناول میں موجودہ تعلیمی زوال

کی طرف بھر پور اشارہ کیا ہے۔ غیر قانونی فعل کو کسی طرح قانونی جامہ پہنانا، جینوین اور پڑھے لکھے لوگوں کا حق مارا جانا، جاہلوں اور نااہلوں کو نوازا جانا.... ہر ہر قدم پر بے انصافیوں کی ایک قطار ہے۔ یہاں تک کہ پروموشن وغیرہ میں بھی حق تلفی سے باز نہیں آیا جاتا۔ یہ ساری چیزیں بہت دھڑلے سے انجام پاتی ہیں۔ منتظمہ تو اس میں ملوث ہوتا ہی ہے حکومت اور تعلیمی میدان کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے والے ادارے بھی جان بوجھ کر خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس زوال کو برسوں میں آنا چاہیے وہ منٹوں میں آجاتا ہے۔ تعلیمی نظام کسی بھی قوم کی ترقی و خوش حالی کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے اور جب اس پر کاری ضرب لگے گی تو پھر وہی نتیجہ سامنے آتا ہے جو آج آنکھوں کے سامنے ہے۔ جب اس میدان میں بھی بے انصافی، بے ایمانی اور حق تلفی کا بول بالا ہوگا تو فطری طور پر سماج اور معاشرت میں گراوٹ آئے گی۔

ناول نگار کو ان باتوں اور نکتوں کو اجاگر کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا ہے جس سے اس نے اپنے طور پر خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ناول میں جس دور کا احاطہ کیا گیا ہے، وہ ملک کی تاریخ کا اہم ترین دور ہے۔ سیاہ اور سفید دونوں، مگر اس کو مکمل سیاہ بھی نہیں کہا جا سکتا، نہ اس کی سفیدی سے یکسر انکار کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام تاریخ کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب سکھوں کے ایک حلقے میں شورش اپنے شباب پر تھی، ساری کوششیں اور مذاکرات ناکام ہو چکے تھے۔ اصل میں یہ حالات مصلحتوں کے بیج بونے کے نتیجے میں سامنے آئے تھے اور ان کا مقصد سیاسی حریفوں کو پسپا کرنا تھا، مگر یہ بیج اتنا توانا ہو گیا کہ اس کی قیمت ملک کی طاقت ور ترین وزیر اعظم کو اپنے محافظوں کی جان دے کر چکانی پڑی۔ ان کے بعد راجیو گاندھی برسر اقتدار آئے۔ انہوں نے پنجاب کی شورش کو قانونی طور پر حل کرنے کی کوشش کی جب کہ یہ مسئلہ سوفی صد سیاسی تھا۔ انہیں کے دور میں شاہ بانو کیس ہوا، جس کا ملک اور بیرون ملک خوب چرچا ہوا۔ راجیو گاندھی نے اسے بھی قانونی طور پر حل کرنے کی کوشش کی جس کے چکر میں ملک کی اکثریت کو یہ احساس ہوا کہ حکومت مسلمانوں کو ناز برداری کرتی ہے۔ احساس کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انہوں نے برسوں سے بند اور تقریباً بھول جانے والے رام جنم بھومی، بابری مسجد کے قضیے کو اجاگر کر دیا اور تالا کھول دینے کی مزموم حرکت کی، جس کے نتیجے میں ملک میں فرقہ پرستی کی آگ ایک دم ابھر آئی اور دیکھتے دیکھتے پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ہونے والے پارلیمانی انتخاب میں جس جماعت کو صرف دو جگہیں ملی تھیں، اسے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو زندہ کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا اور اس نے رام جنم بھومی کی بازیابی کے لیے ملک گیر تحریک شروع کر دی جس کا فطری نتیجہ آگے چل کر بابری مسجد کی شہادت کی صورت سامنے آیا۔ اس وقت کے ملک گیر فسادات نے 1947ء کے فسادات کی یاد تازہ کر دی بلکہ کہیں کہیں اسے مات بھی کر دیا۔ راجیو گاندھی نے سری لنکا کے اندرونی شورش میں بھی دخل دینے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان کی جان بھی چلی گئی۔ ان کے آخری دور میں بوفورس کی خریداری کا مسئلہ ان کے لیے سیاسی مدت کا پیغام لے کر آیا اور ان کے چند قریبی ساتھیوں نے وی پی سنگھ کی قیادت میں ان سے بغاوت کر دی۔ 1989ء کے پارلیمانی انتخاب میں کانگریس کے ہاتھوں سے اقتدار نکل گیا اور وی پی سنگھ کی قیادت میں ایک ملی جلی سرکار کا قیام عمل میں آیا، جس میں بی جے پی جسے پچھلے انتخاب میں دو جگہیں ملی تھیں مگر رام جنم بھومی تحریک کے نتیجے میں نوے (90) جگہیں ملیں اور سرکار میں ایک بڑی حصہ دار کی

صورت شامل ہوئی۔ وی پی سنگھ کا دور اگر چہ مختصر تھا مگر اس نے ملک کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں دور رس تبدیلیاں لا دیں۔ برسوں سے دبی ہوئی منڈل کمیشن کی رپورٹ وی پی سنگھ نے نافذ کر دیا جس سے ملک کا سیاسی چہرہ ایک دم بدل گیا۔ کچھ سیاسی مدبروں کا خیال ہے کہ منڈل کمیشن کو دبانے کی کوشش ہی میں رام جنم بھومی تحریک میں شدت پیدا ہوئی۔ اس صورت حال کو منڈل بہ مقابل کمنڈل کا نام دیا گیا۔ ناول نگار نے اس پورے سیاسی، معاشرتی او رسماجی منظر پر کہیں کہیں اچٹتی ہوئی نگاہیں ڈالی ہیں، کہیں تفصیلی گفتگو کی ہے۔ دراصل اس نے اپنے قلم کو اپنے موضوع پر مرکوز رکھا ہے۔ یوں بھی وہ کوئی تاریخ تو لکھ نہیں رہا تھا۔ اس کا مرکزی کردار ان تمام ادوار اور کیفیات سے گزرتا ہے جس میں وہ تنہا نہیں ہے، ملک کے لاکھوں نوجوانوں کا مقدر بھی یہی ہے۔ اسی اجتماعی جدو جہد اور بے پایاں پریشانیوں نے ناول ''اماوس میں خواب'' کی تعمیر کی ہے۔

منڈل اور کمنڈل کے پس پشت زیر آب بہت ساری سرگرمیاں ملک میں جاری ہو گئیں۔ یہ سچ ہے کہ منڈل معاملہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک Turning Point تھا جس نے ملک کا چہرہ بدل کے رکھ دیا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں ایک منظّم اور سوچی سمجھی اسکیم کے تحت چھوٹے بڑے فسادات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جو 2002ء کے گجرات کے تاریخی فساد کے باب تک آیا۔ 2002ء بھی ملک کی تاریخ کا ایک ایسا میل کا پتھر ہے جس کی دھمک شاید کبھی مدھم نہیں ہوگی۔ دراصل اس فساد نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی سوچ بدل ڈالی۔ جسے وہ برا سمجھتے آئے تھے وہ اچانک انہیں اچھا لگنے لگا۔ ظاہر ہے جب سوچ بدلتی ہے تو حالات بھی اپنی نوعیت بدل لیتے ہیں۔ ملک میں نہایت شد و مد کے ساتھ نئی اصطلاحیں ایجاد کی گئیں۔ گھر واپسی، لو جہاد، گورکشا، وندے ماترم، تین طلاق اور ان سے منسلک بہت سی باتیں۔

کچھ لوگوں کو محسوس ہوگا کہ ناول نگار نے ایک وسیع پس منظر کے تناسب میں بہت سے مسئلوں کو ادھورا چھوڑ دیا ہے یا چھوکر آگے نکل گیا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ فکشن لکھ رہا تھا اور فکشن کی نزاکت اور لطافت میں اس نے تاریخ جیسی بوجھل حقیقت سے بچا لیا ہے۔ یوں بھی ناول نگار نے بہت سی ایسی چیزیں ناول میں شامل کر دی ہیں جن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی اصل وجہ شاید یہ ہے کہ کہیں کہیں ناول نگار خود اپنے ہی جذبات میں گھر گیا ہے اور اس کا قلم اس کے قابو میں نہیں رہا۔

ناول کا مرکزی کردار ایک بار پھر آگ اور راکھ کے کھیل میں ایک مہرہ بن جاتا ہے۔ اس دفعہ شعلے کچھ زیادہ ہی بھیانک اور کافی اونچے تک جا رہے ہیں۔ اس کے اپنے گھر میں بھی سیند پڑ چکی ہے اور وہ تقریباً اجڑ گیا ہے۔ اس کے مقدر میں سب کچھ تنہا ہی جھیلنا لکھا ہے۔ تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ابھی کئی بار اپنے آپ کو دہرانے پر آمادہ ہے، بلکہ تازہ دم ہے۔

حسین الحق نے یہ ناول لکھ کر ایک ایسا قرض ادا کیا ہے جو وہ نہ کرتے تو یہ ہمیشہ واجب الادا رہتا۔ صرف ان کے سر نہیں، ان کے تمام ہم عصروں کے سر بھی۔ ناول تو آج خوب لکھے جا رہے ہیں، طرح طرح کے موضوعات بھی اُبھر آئے ہیں، مگر ان ناولوں میں اپنے زمانے کی روح کا فقدان ہے۔ سامنے کا زمانہ بے حد زخمی ہے، کراہ رہا ہے، یہاں پر لوگوں کی نگاہیں تھم گئیں اور ساری ذمہ داری تاریخ دانوں کے سر ڈال کر لوگ اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھنے لگے۔ آج تاریخ کو دیدہ و دانستہ جس طرح توڑ امڑوڑا جا رہا ہے، ایسی صورت میں کس تاریخ داں سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ سچ ہی بولے گا، سچ کے سوا کچھ نہیں بولے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فکشن

سچ کا صحیفہ ہوتا ہے مگر یہ میرا یقین ہے کہ فکشن نگار جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کرے، پھر بھی اس کی تحریر میں کچھ نہ کچھ سچ در آئے گا ہی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ فکشن زمانے کی نمایندگی کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

حسین الحق کا یہ ناول ایک عرصہ کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے ان کے دو ناول لگاتار آئے تھے۔ ظاہر ہے اس عرصے میں فکشن نگار حسین الحق کی سوچ اور آنکھیں بند نہیں رہی ہوں گی، ان کے لاشعور میں ناول بننے کا کام چل رہا ہوگا۔ اس ناول کو تحریری شکل میں لانے کے لیے یقیناً انہیں کافی وقت لگا ہوگا۔ حسین الحق جیسے ممتاز فکشن نگار سے جس کے پاس ایک خوب صورت اور معیاری زبان بھی ہے اگر ایک بے حد معیاری اور صف اول کے ناول کی توقع کی جائے تو یہ ہرگز بے جا نہیں، مگر ناول کے گہرے مطالعے سے کہیں کہیں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اس پر وہ محنت کی جو اس موضوع کا حق تھا۔ لکھنے کے علاوہ وہ اس پر وقفے وقفے سے نگاہیں بھی ڈالتے رہتے تو یہ ناول بے حد گٹھا ہوا اور کرافٹ مین شپ کا نمونہ بن جاتا۔ یوں بھی ہمارے ہاں ناول لکھنے کے سلسلے میں ریسرچ اور ایڈیٹنگ کی روایت نہیں ہے۔ بعض مغربی ناول نسبتاً ہلکے پھلکے موضوع ہونے کے باوجود ہمارے ناولوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کو لکھتے وقت حسین الحق ایک خاص قسم کی دردمندی میں مبتلا رہے۔ شاید اسی لیے انہیں وہ کمزوریاں نظر نہیں آئیں جو اگر نہ ہوتیں تو یہ ایک ایسا ناول ہوتا جو فکشن کی دنیا میں یقیناً ایک تاریخ رقم کرتا۔ میں نے ایڈیٹنگ کا نام لیا، شروع کے پچاس ساٹھ صفحات کو وہ اگر اپنی روایتی شگفتہ بیانی میں تحریر کرتے تو ناول کی Readability بہت بڑھ جاتی۔ صحافیانہ رنگ نے بھی کہیں کہیں ناول کو مجروح کیا ہے۔ خاص طور پر اخلاق والا واقعہ ..... حسین الحق ایک منجھے ہوئے فکشن نگار ہیں۔ ناول میں انہوں نے رمز و اشارت سے بہت کام لیا ہے پھر ایسے واقعے کو انہوں نے من وعن کیوں بیان کر دیا؟

منڈل کمیشن کے نافذ ہونے کے بعد نام نہاد پچھڑے طبقے میں جو زبردست بیداری پیدا ہوئی، جس کے نتیجے میں طرح طرح کی مضحکہ خیز حرکتیں بھی سرزد ہوئیں، اس کی بہت دلچسپ تحریری تصویر ناول میں موجود ہے۔ نام نہاد لو جہاد کی انہوں نے نہایت سچی اور دردناک تصویر کشی فکری تناظر میں پیش کی ہے۔ حسین الحق کے اس ناول کی بڑی مضبوطی ان کی زبان ہے جس کا جوہر ان کے اکثر افسانوں میں کھلتا رہا ہے۔ میں بیانیہ کے تنازعہ میں نہیں پڑتا۔ ہر لکھنے والے کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ فکشن کے لیے کوئی خاص ڈکشن ہی استعمال کی جائے۔ پھر پڑھنے والے کی بھی اپنی نگاہیں اور نقطہ نظر ہوتا ہے۔ حسین الحق کی زبان قابل رشک ہے۔ ان کے بعض کمزور افسانے محض زبان کی وجہ سے قائم و دائم رہے۔ کم از کم مجھے پورے ناول میں کہیں بھی زبان کی لڑکھڑاہٹ اور ہکلا پن دکھائی نہیں دیا۔ حسین الحق کو بہر کیف فکشن کی زبان لکھنا آتا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو ان کا یہ ناول پسند نہ آئے مگر وہ اس میں استعمال کی گئی زبان کی خوب صورتی اور دل کشی کو جھٹلا نہیں سکتے۔ بھلے ان کے دل کا چور ان کے کانوں میں کچھ اور سرگوشیاں کرتا رہے۔

دنیا کا کوئی ادب بھی مکمل خوبیوں کا نمونہ نہیں ہوتا۔ اپنی چند کمزوریوں کے باوجود ادھر تیس چالیس برسوں میں جو ناول لکھے گئے ان میں حسین الحق کا یہ ناول یقیناً اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں درجہ بندی کا قائل نہیں ہوں مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مجموعی طور پر یہ ناول بے حد اہم ہے اور اس کو کسی صوت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مضمون

اسیمؔ کاوِیانی

وہ کاغذ کی کشتی، وہ بارش کا پانی (عہدِ طفلی کا ادب)

کیا آج کے دور میں ننھے بچوں کی Pre-schooling، گھروں میں مسلسل چلتے ٹیلی ویژن کے پروگراموں اور مادّیت اور روزگار کی کشاکش میں اُلجھے والدین کی اپنے بچوں سے دُوری نے ان بچوں کا بچپن بھی ویسا ہی فطری، معصوم اور حیراں رکھ چھوڑا ہوگا جیسا کہ نصف صدی قبل کے بچوں کو میسّر تھا! شاید نہیں۔

دنگ کرتے تھے ہمیں پتلی تماشوں والے
اب تو بچوں کے مشاغل نہیں بچوں والے

بھلا بچوں سے زیادہ کہانیاں سننے کی چاہ کسے ہوسکتی ہے ؟ لیکن آج کی مشینی زندگی میں قصّے کہانی سننے سُنانے کی روایت ہی کہاں باقی رہی! دو تین دہائی قبل تک بھی گھروں میں بڑے بوڑھے (عموماً نانی یا دادی) بچوں کو ایسی دل چسپ اور سبق آموز کہانیاں سُنایا کرتے تھے کہ در پردہ بچوں کی ذہنی تربیت بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اُن کہانیوں کا متبادل آج کی Pre-schooling شاید ہی بن سکے۔

ہمیں اپنے عہدِ طفلی کی وہ راتیں اب تک یاد ہیں، جب ہم سب بھائی بہن اپنے اپنے بستروں میں پہنچتے ہی چادریں تان کر 'کہانی، کہانی' کی رٹ لگانا شروع کر دیتے تھے اور عموماً والدِ محترم (کبھی کبھار والدہ) کوئی نہ کوئی ایسی کہانی چھیڑ دیتے تھے کہ ہم کب انٹاغفیل ہوئے، خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ وہ جانوروں، جادوگروں، بادشاہوں اور پیغمبروں کی نت نئی کہانیاں اتنی دل چسپ ہوا کرتی تھیں کہ انھیں سننے سے کبھی جی نہ بھرتا تھا۔

ہمیں کھیل کود سے، خاص طور پر outdoor کھیلوں سے کبھی کوئی رغبت نہیں رہی، بس اپنے گھر اور شاید محلّے کی حد تک ہم کیرم کے اچھے کھیلنے والوں میں گِنے جاتے تھے۔ اگر عہدِ طفلی کا اور کوئی محبوب مشغلہ یاد ہے تو وہ ہے کاغذ کی کشتی بنا کر پانی میں چھوڑنا اور اُسے بہتے پانی یا ہوا کے رُخ پر، دل چسپی سے بہتا ہوا دیکھنا۔ خصوصاً بمبئی کی بارشوں میں جہاں کہیں پانی کا نالا رواں ہوتا یا پانی جمع نظر آتا، ہم اپنی رف بیاض سے ورق نکال کر، کشتی بنا کر چھوڑ دیتے تھے۔ جب وہ پانی میں رُل مل جاتی تو کچھ لمحوں کے لیے اُداس بھی ہو جاتے تھے۔ کبھی کوئی دبیز آرٹ پیپر مِل جاتا تو اُس کی کشتی زیادہ دیر تک رواں رہتی اور ہم دیر تک مسرور رہتے۔

خیر، تو ذکر ہو رہا تھا عہدِ طفلی کی کہانیوں کا۔ ایک ایسی ہی موسمِ باراں کی رات میں ہم بچے اپنے بستروں میں دُبکے ہوئے تھے۔ والدِ محترم نے ایک نئی کہانی شروع کی۔ اب ہمیں اس کا صرف آغاز یاد ہے، دیکھیے، باقی کہانی شاید آپ کو یاد آ جائے:

بات کی بات،
خرافات کی لات
ببول کے کانٹے پر تین تالاب
دو سوکھے ساکھے، ایک میں پانی نہیں
جس میں پانی نہیں، اُس پر آئے تین کمہار
دو لُولے لنگڑے، ایک کے ہاتھ نہیں
جس کے ہاتھ نہیں، اُس نے بنائی تین ہانڈیاں
دو ٹوٹی پھوٹیں، ایک کے پیندا نہیں
جس کے پیندا نہیں، اُس میں پکائے تین چاول
دو کچّے پکّے، ایک گلا نہیں
جو گلا نہیں، اُس پہ بُلائے تین مہمان

دورو ٹھے راٹھے، ایک آیا نہیں
جوآیا نہیں اُس کے مارے تین ڈنڈے
دوچُو کے چاکے، ایک لگا نہیں
جو لگا نہیں وہ جاکے گرا ایک چنے کے کھیت میں....

بچپن کے دور کی سادہ دلی اور معصومیت اس طرح کی کہانیوں کے بے تکے پن یا غیر عقلی ہونے کو کب خاطر میں لاتی تھی! کہانیاں جس قدر حیرت انگیز اور نا قابلِ یقین ہوتی تھیں، ہم اُتنے ہی مزے لے لے کر اُنھیں سنا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب تک علم اور تجربے کے اندیشۂ سود وزیاں سے بچوں کا دل آزاد ہوتا ہے، اُن کے من میں سمانے کے لیے کبھی کبھی یہ کائنات بھی کم نظر آتی ہے۔ غرض کہ وہ ایسے ہی دن تھے جب ہم نے طرح طرح کی کہانیوں سے اپنا پُرانا بستہ بھر رکھا تھا۔ بہت سی کہانیاں یاد کر لی تھیں جنھیں ہم اپنے دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔ جس میونسپل اردو اسکول میں پڑھنے جایا کرتے تھے، وہاں ہمارا نام ہی 'کہانی والا' پڑ گیا تھا۔ جس طرح بوہرہ لوگوں میں نام کے ساتھ فرنیچر والا، خورا کی والا، باٹلی والا لگا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کبھی لنچ بریک کے بعد ہماری کلاس ٹیچر کی پلکیں نیند سے جھپکنے لگتیں یا اُنھیں اپنی پڑوسی ٹیچر سے گپ شپ کرنا ہوتی تو بچوں کو شور شرابہ اور شرارتیں کرنے سے روکنے کے لیے ناچیز کہانی والا کو کوئی کہانی سنانے کا حکم دے دیا جاتا تھا اور سارے بچے ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔ دقّت تو اُس وقت پیش آئی جب آس پاس کی کلاس ٹیچروں نے بھی ہماری خدمات کو حاصل کرنا شروع کر دیا۔ خیر، اِن کہانیوں کے شوق نے ہمیں بچوں کے رسالوں کی طرف متوجہ کیا۔

اُس زمانے (1964-65ء) میں بچوں کے تین ماہ نامے ہمارے دل کی دھڑکنوں میں سمائے ہوئے تھے۔ '**کھلونا**' اور '**پیام تعلیم**' (نئی دہلی) اور '**کلیاں**' (لکھنؤ)۔ تینوں کا رنگ ایک دوسرے سے نیارا تھا۔ 'کلیاں' کی بیشتر کہانیاں کچھ یوں شروع ہوتی تھیں! '...ہمارا تمھارا خدا بادشاہ... یا...ایک تھا بادشاہ اُس کی سات رانیاں تھیں.... یا اُس کا اپنی جان سے بھی پیارا ایک شہزادہ تھا۔ شہزادے نے ایک دن بادشاہ سے شکار پر جانے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ نے اُسے تنبیہ کی کہ تین کھونٹ جانا، چوتھی کھونٹ ہرگز نہ جانا۔ اتنا پڑھتے ہی ہم ساری کہانی سمجھ جاتے تھے کہ شہزادہ ضرور چوتھی کھونٹ ہی جائے گا۔ اپنے سپاہیوں سے بچھڑے گا۔ نت نئی بلاؤں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہوئے نہ صرف سُرخ رو ہوگا بلکہ آخر میں ضرور کسی حسین شہزادی کو حاصل کر لے گا۔ شہزادہ سارے معرکے جھیل لے گا تو اُسے تلاش کرتے ہوئے سپاہی بھی آ پہنچیں گے۔ (شاید اسی روایت کا اثر ہے کہ آج کے داروغہ بھی حادثے ہو چکنے کے بعد موقعہء واردات پر پہنچتے ہیں) اگر کسی کہانی میں شکار کا پروگرام ٹل جاتا تو ہمارا شہزادہ اپنے سوتیلے بھائیوں کی سازش کو ناکام کرنے یا پھر نمک حرام وزیر کی غدّاری سے اپنی سلطنت کو بچانے کی مہم سرانجام دیتا ہوا ملتا تھا اور اس طرح پڑھنے والوں کی واہ واہی لُوٹ لیتا تھا۔ کئی کہانیوں میں ہیرو کو بس کسی ایسے توتے کی گردن ہی مروڑنا ہوتی تھی، جس میں کسی شہزادی کو قید میں رکھنے والے جن، دیو یا جادوگر کی جان اٹکی ہوتی تھی، لیکن اس توتے کے پنجرے تک پہنچنے کے ہفت خواں طے کرنے میں اسے اپنی دلیری کے ایسے ایسے جوہر دکھانے پڑتے تھے کہ شہزادی اُسے دل دے بیٹھے اور پڑھنے والے پُکار اُٹھیں!

پہلو میں سب جگر ہی جگر ہے دلیر کے
ہے دِل ہی دِل بھرا ہوا سینے میں شیر کے

'**کلیاں**' میں پڑھی مظہرالحق علوی کی '**گھر کا بھیدی**' اور **چچا مُرغی کی کہانیاں** (چچا مُرغی سسرال گئے وغیرہ) عفّت موہانی کی کھلکھلاتی تحریریں اور صاحب

طرزِ مصور بختیار سعید کی مصوری کے نقوش آج بھی ذہن پر مرتسم ہیں۔ '**پیام تعلیم**' میں زیادہ زور معلوماتی اور نصابی نوعیت کی تحریروں پر تھا۔ اس وقت مجھے کبھی کا پڑھا ہوا بچوں کا ناول '**کومے وا وا**' اور ظ.انصاری کی بچوں کے لیے لکھی غالباً واحد تحریر '**حاجی بمبا کی ڈائری**' یاد آرہی ہے۔ یہ دل چسپ کردار اپنے وطن سے نکلا تو حج کرنے کی نیت سے تھا، لیکن (دخانی) جہاز ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے اسے بمبئی سے بیرنگ لوٹ جانا پڑا تھا، یوں وہ 'حاجی بمبا' مشہور ہو گیا تھا۔ اس کہانی میں ایک دلچسپ کردار اُس کی سکریٹری کا بھی تھا۔

آٹھ سے اسّی سال تک کے بچوں کے پیارے '**کھلونا**' کا انداز ان دونوں جریدوں سے جداگانہ تھا۔ اس میں جادوگروں، بادشاہوں کی کہانیوں یا بوجھل درسی طرز کے مضامین کی بجائے ہماری جیتی جاگتی زندگی کی پُرلطف کہانیاں چھپتی تھیں۔ اس پرمستزاد باتصویر فیچرس (مثلاً '**میاں فولادی**'، '**رومی**')، میاں بڑھاکو کے معلوماتی مضامین، **تاریخ پارے**، کارٹونی لطیفے، مختصر یہ کہ یہ رسالہ اردو کے مشہور مصنفین کی نگارشاتِ قلم کے ساتھ جگدیش پنکج، سُدھیر اور اِمروز جیسے مصوروں کے آرٹ سے سجا سنورا ہوا کرتا تھا۔

'**کھلونا بک ڈپو**' کی فوٹو آفسیٹ کی دیدہ زیب طباعت اور دل کش ورنگین سرورق سے سجی جیبی سائز کی کہانیاں بھی بھلائے نہیں بھولتیں۔ آج بھی کبھی عالمِ خیال میں کسی سمت سے '**نوپھول راج کماری**' اِٹھلاتی چلی آتی ہے یا کسی گوشے سے '**شریر لڑکا**' دوڑتا ہوا آدھمکتا ہے۔ کبھی '**برف کا آدمی**' اور '**نیلی کھوپڑی**' کی یاد رگوں میں سرد لہر دوڑا دیتی ہے تو کبھی '**چندا ماموں**' اور '**سرکس کے کھیل**' لطف ومسرت کے گہوارے میں پہنچا دیتے ہیں۔ دل چسپ اور مزے دار کہانیوں کا ایک ریلا تھا، جنھیں پڑھ کر سیری نہیں ہوتی تھی۔ قہقہہ بردوش '**گھسیٹا کی بھتنا شاہی**' (منظوم طویل کہانی، غالباً سعید سہروردی کی!) اور من موہنی '**چڑیوں کی الف لیلہ**' جیسی کبھی نہ بھلائی جانے والی (جزوی طور پر) مصور کہانیاں، دنیا کی کسی بھی زبان کے بچوں کے ادب کا سرمایۂ ناز کہلا سکتی ہیں، لیکن ہماری آج کی نسل ان سے انجان ہے۔ ان کہانیوں سے جو ملا، وہ کبھی درسی کتابوں سے نہ مل سکا۔ اگر درسی کتابوں سے آگہی بڑھی تو یہ بھی پتا چلا کہ ع ہے آگہی کے بعد غمِ آگہی بہت!

بچوں کی کہانیاں اور جریدے پڑھ پڑھ کر ہم نے کچھ کچھ قلم فرسائی بھی شروع کر دی تھی۔ ہوا یُوں کہ پانچویں جماعت سے ہمارے نصاب میں ہندی اور انگریزی بھی شامل ہو گئی تھی۔ چھٹی جماعت (65-1964) میں ہندی کی کتاب میں ایک ڈراما تھا، '**منگل مندر**'۔ قصّہ کچھ یوں تھا کہ موہن نامی ایک ننھا طالب علم جب دیوالی کے دن صبح نہا دھو کر تیار ہو گیا تو اُس کے بڑے بھیّا نے اُس سے کہا کہ وہ قریب ہی واقع مندر میں جا کر بھگوان کے درشن کر آئے اور پرنامی میں ایک روپیا بھی دے آئے۔ ساتھ ہی اُنھوں نے موہن کو دیوالی کی بخشش بھی دی۔ راستے میں موہن کو ایک بوڑھا اور اندھا بھکاری ملا، جس کا ہاتھ تھامے اس کا بچہ بھوک سے بلک کر رو رہا تھا۔ وہ بوڑھا ایک درد بھرا گیت گا رہا تھا، جس میں دُکھیوں کی مدد کرنے کا سندیش تھا۔ موہن نے اپنی بخشش اور پرنامی کا روپیا اُس بوڑھے کو دے دیا تاکہ وہ اپنے بچے کے ساتھ کہیں بھوجن کر لے۔ گھر پہنچ کر موہن نے اپنے مندر نہ جا پانے کا ملال ظاہر کرتے ہوئے اپنے بڑے بھیا کو سارا قصّہ سنا دیا اور ڈرتے ہوئے پوچھا کہ کہیں بھگوان اُس سے ناراض تو نہیں ہو جائیں گے؟ اِس پر موہن کے بھیا نے اُسے شاباشی دیتے ہوئے یوں سمجھایا کہ

یہ تو اُس نے مندر کی پوجا سے بھی بڑا کام کیا ہے۔ غریبوں کی مدد کرنا تو '**منگل مندر**' اور اصل دھرم ہے۔ اُنھوں نے موہن کو مزید بخشش دے کر خوش کر دیا۔ یہ ڈراما اردو میں ڈھال کر ہم نے اسے اپنی پہلی تخلیق (ترجمہ سہی) کے طور پر 'پیامِ تعلیم' میں بھیج دیا اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہی ڈرامے کا یہ پیغام کہ 'حسنِ عمل، رسمی عبادت سے بڑھ کر ہے' ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو گیا۔ گویا ع

سبق یہ پہلا تھا راہِ خدا کا۔

پہلی کہانی کی اشاعت کی خوشی میں سرشار ہو کر ہم نے ایک کے بعد ایک دو کہانیاں اور بھیج دیں۔ ایک بھی شائع نہیں ہوئی۔ غصے میں آ کر ہم نے اڈیٹر کو خط لکھ مارا کہ '**کھلونا**' اور '**کلیاں**' کے مقابلے میں '**پیام تعلیم**' کے مضامین بڑے خشک اور بے مزہ ہوتے ہیں اور یہ تو بچوں کی بجائے بوڑھوں کا رسالہ لگتا ہے۔ اڈیٹر (شاید محمد حسین حسّان ندوی تھے!) نے اپنے اداریے میں بڑے مزے لے کر اس خط کا ذکر کیا تھا کہ 'ہمارے ایک پیامی نے '**پیام تعلیم**' کو بوڑھوں کا رسالہ بتایا ہے۔ رسالے کے مضامین کا انتخاب ہم بچوں کی بھلائی اور تعلیمی رہنمائی کے لیے کرتے ہیں......وغیرہ۔' ہماری دوسری کہانی '**کلیاں**' میں چھپی تھی (جس پر اڈیٹر شمیم انہونوی نے ''**ننگ خدمت**'' کا عنوان لگایا تھا۔) جو اس مشہور تاریخی واقعے پر مبنی تھی کہ ایک بار امریکی صدر ابراہام لنکن سادہ بھیس میں گھوڑے پر سوار شہر کا حال جاننے کے لیے گشت پر نکلے تو اُنھیں راستے میں کہیں ایک بڑا پیڑ گر پڑنے سے سواریوں کی آمد و رفت رُکی ہوئی نظر آئی۔ چند لوگ وہ پیڑ ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے، جب کہ قریب ہی کھڑا ایک داروغہ اُنھیں اور زور لگانے کے لیے پھٹکار رہا تھا۔ ابراہام لنکن نے داروغہ کو ٹوکا کہ ''وہ اُن لوگوں کو پھٹکارنے کی بجائے اُن کی مدد کیوں نہیں کر دیتا!'' تو اُس نے حقارت سے جواب دیا، ''شاید تم مجھے جانتے نہیں، میں یہاں کا داروغہ ہوں۔'' یہ سن کر ابراہام لنکن نے خود اُس پیڑ کو ہٹانے میں لوگوں کی مدد کی اور پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے داروغہ سے کہا: ''آیندہ بھی جب کبھی مدد کی ضرورت پڑے تو اپنے صدرِ مملکت کو یاد کر لینا۔'' اس کے بعد اُس داروغہ کا جو حال ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس کہانی سے ملا یہ سبق کہ 'کوئی کام چھوٹا نہیں ہوتا اور خدمتِ خلق کا فرض انجام دینے میں کوئی شرم آڑے نہیں آنی چاہیے' بھی زندگی بھر کے لیے یاد ہو گیا۔

بس دو تین سال کا فاصلہ حائل تھا، ہمیں کیا پتا تھا کہ ہماری کہانیاں ('**خزانے کی تلاش**'، '**لوہار کی ایک**' اور '**خون کا دریا**') '**کھلونا**' کے اُن صفحات پر چھپیں گی، جنھیں کرشن چندر، عصمت چغتائی، سراج انور اور اظہار اثر جیسے مقبول مصنفین رونق بخش رہے تھے۔ وہ کہانیاں ہمارے اوّلین قلمی نام **انجم پرویز** کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ (چوں کہ ہمارے اُستاد نے اصل فارسی قصّے کی رو سے ہمیں بتایا تھا کہ یہ شیریں اور شاہ پرویز کے عشق کا قصّہ ہے اور شیریں، پرویز کی ملکہ بھی بنی تھی۔ نامراد فرہاد تو بعد میں قصّے میں ٹپک پڑا تھا، اس لیے ہم نے پرویز کو جزوِ نام کیا تھا، یہ اور بات ہے کہ ہمیں کوئی شیریں نہیں ملی۔ اسیم)

'**کھلونا**' میں چھپنے سے قبل '**ٹافی**'، '**شریر**'، '**معصوم**'، '**جھلکیاں**' اور '**مسرت**' جیسے کئی بچوں کے رسالوں سے سابقہ رہا۔ غالباً آٹھویں جماعت میں تھے تو ہمارے آرٹ کے ٹیچر عبدالغنی سوداگر نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر ماہ نامہ '**نونہال ٹائمز**' (بمبئی) جاری کیا تھا۔ اسی طرح ہمارے ایک اُستاد فخر احمد انصاری (موجؔ صہبائی، بنارسی) ہم طلبا کی نگارشات اکٹھا کر کے انھیں کسی خوش نویس سے لکھوا کر ہر سال '**کھلتی کلیاں**' کے نام سے ایک قلمی میگزین تیار کر دیا کرتے تھے۔ گلستانِ طفلی کے یہ وہ پھول ہیں جو اپنی چند روزہ بہار

دکھلا کر چلے گئے۔ ان میں کئیوں کے صفحات ہمارے عہدِ طفلی کے مشقِ قلم کے گواہ ہیں۔ اسی دور میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کے شعبۂ تعلیم کی طرف سے ایک نہایت حسین اور پُرکشش جریدہ **'شبنم'** شائع ہوا کرتا تھا۔ دل خوش کُن بات یہ ہے کہ وہ بچوں کا رسالہ واقعی بچوں کا رسالہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل کی طرح نہیں کہ اگر کوئی اسی ریاست کا واحد اردو آرگن **لوک راجیہ** (جو شاید سابقہ ادبی جریدے 'قومی راج' کی جگہ جاری ہے) ہاتھ میں لے لے تو سوچ میں پڑ جائے کہ کہیں اُس نے غلطی سے ٹور ازم (محکمۂ سیاحت) کا پبلسٹی جرنل تو نہیں اُٹھا لیا!

ایک تو محلّے اور گردونواح میں لائبریریاں ہی گنتی کی تھیں، پھر وہاں کے محدود ذخیروں میں جو چیزیں ہمارے مذاق کی تھیں اُنھیں ہم چاٹ چکے تھے۔ جب درجۂ ہفتم میں تھے تو ہمیں کلاس ٹیچر نے بتایا کہ کوئی ایک فرلانگ پر واقع **'آشا سدن'** ('ڈونگری چلڈرن ہوم، بمبئی) میں ایک دارالمطالعہ، بچوں کی جیل میں بند لڑکے لڑکیوں کے لیے بنا ہوا ہے۔ وہاں شام میں چند گھنٹوں کے لیے باہر کے طلبا کو بھی مطالعے کی اجازت ہے۔ بس پھر کیا تھا، ہم اُس چلڈرن ہوم کے دیوپیکر چوبی دروازے کے قد آدم ذیلی دریچے سے راہ داری دکھا کر اندر داخل ہوئے، جہاں ایک کشادہ اور صاف ستھرے دارالمطالعے میں... دیواروں سے سٹی مراٹھی، اردو اور ہندی کی کتابوں کی الماریاں ٹکٹکی باندھے ہمیں گھور رہی تھیں اور ہال میں بچھی خالی میزیں اور کرسیاں بھی گویا چشمِ حیراں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ صرف ایک متنفّس وجود، بیس بائیس سال کی دل کش خدو خال کی نازک اندام مہاراشٹرین لڑکی کا نظر آیا۔ جس نے لائبریری انچارج کی حیثیت سے خود کو متعارف کراتے ہوئے خوش دلی سے ہمیں ممبر بنایا اور معذرت خواہی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ چوں کہ وہ اردو نہیں جانتی، اس لیے ہم اپنی پسند کی اردو کتابیں الماری میں سے خود ڈھونڈ لیں، البتہ ہندی اور مراٹھی کتابوں کے لیے اُسے کہہ دیا جائے۔ ہماری ایک دو ہفتے کی مسلسل حاضری سے یگانگت اتنی بڑھی کہ ایک دن اردو کتابوں کا کورا رجسٹر لے کر اُس نے ایک رفیقانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے انڈکس تیار کرنے میں مدد مانگی۔ ہم نے نہ صرف دیوناگری لپی میں انڈکس مکمل کرنے میں اُس کی مدد کی بلکہ انڈکس نمبروں کی اردو لپی کی چٹیں خود لکھ کر چپراسی کے ذریعے تمام اردو کتابوں پر لگوا دیں۔ مارچ کے آخری دنوں میں جب وہاں ہمارے مطالعے کے لیے کچھ بچا نہیں تھا اور ہم مِس لائبریرین کو الوادع کہنے کو تھے، ایک دن اُس نے ایک حکم نامہ ہاتھوں میں لہراتے ہوئے ہم سے مسکرا کر کہا کہ ڈیڑھ دو ہزار روپیوں کی نئی کتابیں اردو کے زمرے میں، اسی ماہ خریدنے کا حکم آیا ہے۔ نئی کتابوں کی اطلاع تو گویا ہمارے لیے گرما کی چھٹیوں کو بڑے مزے سے گزارنے کی نوید تھی۔ قصّہ مختصر ہم نے مِس لائبریرین کو مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ (بمبئی) میں لے جا کر کتابوں کی شاپنگ کا خوش گوار فریضہ بھی انجام دیا۔ برانچ منیجر **شاہد علی خاں** کا مِس لائبریرین کے لیے طرزِ تپاک دیدنی تھا، لیکن ہم حکومت کے کسی ادارے کی مطبوعات **'موسم کے بارے میں سو سوال'**، **'نو سیّارے اکتیس چاند'**، **'گلی لیو کی دنیا'** اور ایسی ہی طرح طرح کی کتابوں کے سلیکشن میں گُم تھے۔

بمبئی کے مشہور و معروف **'محمد علی روڈ'** پر جے جے اسپتال کی سمت، 'زین العابدین بلڈنگ' میں گراؤنڈ فلور پر تب ایک 'ہنجیرہ موٹر ٹریننگ اسکول' ہوا کرتا تھا۔ (اب گھڑیوں کے پُرزوں کی دکانیں ہیں) ایک بار آتش زدگی کے بھیانک حادثے کے بعد جب موٹر ٹریننگ اسکول دائمی طور پر بند ہو گیا تو اُس کے اوٹلے پر پُرانی کتابوں کا ایک سوداگر آ کر آباد ہو گیا۔ وہیں پر ہم

پہلی بار 'غنچہ' اور 'پھول' سے لے کر 'پھلواری' جیسے کئی رسالوں کے رنگ و بُو سے آشنا ہوئے۔ ان رسالوں میں سے کچھ بند ہو چکے تھے تو کچھ کا چل چلاؤ تھا۔ وہیں پر جب 'کھلونا' کی کم سنی کے عہد کے چھوٹی سائز کے کئی خاص نمبر ملے تو ہمیں تو گویا دولتِ کونین مل گئی۔

اُن دنوں ہم **مولانا ابوالکلام آزاد** کو اپنی چھوٹی سی بارگاہِ ادب سے بہت دور کوئی عالمِ بالا کی ہستی سمجھتے تھے۔ ایک دن جو دیکھا تو 'پھلواری' کے ایک سال نامے کے صفحات پر مولانا اپنے دونوں ہاتھوں میں بانس پکڑے فضا میں پھڑ پھڑاتی چڑیوں کی چُوں چُوں سے پریشان ایک گھونسلے کو گھورتے ہوئے نظر آئے۔ اِس اسکیچ کے ساتھ اُن کی ('غبارِ خاطر' سے ماخوذ) چڑیوں سے معرکہ آرائی کی پُر لطف کہانی پڑھ کر پہلی بار احساس ہوا کہ بڑے میاں پیٹ میں داڑھی لے کر نہیں پیدا ہوئے تھے اور ع گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار اُن پر بھی!

'بھنڈی بازار' کے جنکشن پر واقع وسیع و عریض '**وزیر بلڈنگ**' بھی اس اعتبار سے ایک تاریخی کردار کی حامل ہے کہ اس کے ہوٹل میں عموماً شہر کے شعرا اور ادبا چائے کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں پر بڑی بڑی ادبی بحثیں کرتے نظر آتے تھے (اُن کا ذکر پھر کبھی)۔ اسی بلڈنگ کی لبِ سڑک دکانوں میں سے ایک '**ناز بک ڈپو**' ہمیں دو باتوں کی بنا پر اب تک یاد ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ بک ڈپو '**شمع**' ادبی معموں کا کلیکشن سینٹر ہوا کرتا تھا۔ معمّے کی آخری تاریخوں میں بک ڈپو کے سامنے فٹ پاتھ پر دُور تک تانے ہوئے شامیانے تلے سر نیہوڑائے معمّے باز اپنی فکر میں غلطاں عجیب نظّارہ پیش کرتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ والدِ محترم ہماری درسی کتابیں اور کاپیاں ہمیں اسی بک ڈپو سے دلایا کرتے تھے اور ہم درسی کتابوں کے ساتھ **کھلونا بک ڈپو** کی چند ایک کہانیاں اور چند پاکستانی رسالے بالخصوص '**ہمدرد**' (کراچی) کا '**نونہال**' ضد کر کے ضرور خرید لاتے تھے۔ وہ خود کے لیے '**انجام**' (کراچی) لیتے تو ضمیمہ '**بچوں کا انجام**' ہمیں مل جاتا تھا۔

اس انگریزی کے L کی شکل کی دیو قامت وزیر بلڈنگ کے بیچ کے کھلے گراؤنڈ میں، وہیں ایک کونے میں واقع '**سلور بُک ایجنسی اور پریس**' کے کاغذ کے رول اور کتابوں کے گٹھر پڑے رہتے تھے۔ ہم وہیں اپنی کتابیں جلد بندی کے لیے دیا کرتے تھے۔ اور وہاں کی چھپی کہانیاں بھی پڑھا کرتے تھے۔ وقت گزرتا گیا... **وزیر ہوٹل** دھند میں کھو گیا۔ ایک نئی ملکیت میں نئی آب و تاب کے ساتھ 'شالیمار ہوٹل' نمودار ہوا۔ کُھلے گراؤنڈ کو 'شالیمار' کی دیوار و سقف نے ڈھانپ لیا۔ سلور کا چھاپہ خانہ غائب ہو گیا، لبِ سڑک پر ایک چھوٹی سی دکان ظاہر ہوئی۔ '**نیو سلور بُک ایجنسی**'۔

اُس زمانے میں بمبئی کے فورٹ اور فلورا فاؤنٹین علاقوں کے بُک اسٹالوں پر '**ٹارزن**'، '**آرچی**' اور '**لی فاک**' کے ہیرو '**فینٹم**' کی پوری طرح مصور کہانیوں کے انگریزی جرنل دیکھ کر انھیں پڑھنے کے لیے دل بہت للچاتا تھا، لیکن وہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اردو زبان میں اس طرح کی باتصویر کہانیوں کی حسرت ہی رہی۔ بہت بعد میں جب ایک بار روزنامہ '**انقلاب**' (بمبئی) کی ابتدائی دہائیوں کی فائلیں ملاحظے میں آئیں تو اُن میں کسی نومشق رتن دیپ کی قسط وار تصویری کہانی '**الٰہ دین**' کا سلسلہ دیکھ کر پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ مصور نے شاید کارٹون کا کارٹون بنانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی حکمت بھی سمجھ میں آ گئی کہ اسلام نے تصویر کشی کی ممانعت کیوں کی تھی۔

بمبئی کا ایک قدیم مصوّر جریدہ '**کارٹون**' بھی نظر سے گزرا تھا، جو غالباً زیادہ نہ چل سکا تھا۔ آخر ستّر کی دہائی کے آخر میں

جب مالیگاؤں سے محمد **یوسف انصاری** اور **بختیار سعید** نے ایک مکمل طور پر مصور جریدہ '**اردو کومک**' جاری کیا تو ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ آج بھی یاد آتا ہے کہ اُس کے ہر شمارے کا کتنی بے صبری سے انتظار رہا کرتا تھا۔ اِن سطور کو لکھتے ہوئے بھی ہم اپنے اردگرد فراعنہ مصر کی ممیوں کو سرگوشیاں کرتے اور ابوالہول کو پلکیں جھپکاتے پا رہے ہیں، جن کی مصور کہانیاں '**اردو کومک**' کے اوراق میں دفن ہیں۔ ہم اس کے چیستاں حل کرنے اور کوئز مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتے تھے۔ ایک دن ہمیں خط ملا کہ 'اردو کومک' کا پُر جوش قاری رسالے کے اڈیٹر اور مصور (یوسف اور بختیار) سے ملنا چاہے تو '**وزیر ہوٹل**' (بمبئی) کے گیسٹ ہاؤس میں آ کر ملاقات کر لے۔ '**وزیر بلڈنگ / ہوٹل**' گھر کے قریب ہی تھا۔ ہم خوشی خوشی مقررہ وقت پر وہاں پہنچے اور اُن سے مل کر حیران رہ گئے کہ یہ تو اسی دنیا کے ہم جیسے ہاڑ ماس کے دُبلے پتلے دو آدمی ہیں اور '**اردو کومک**' جیسا مصور رسالہ نکال رہے ہیں!

دسویں جماعت میں اپنے ایک ساتھی محسن اختر انصاری کی سرکردگی میں ہم چند دوستوں نے مِل کر بچوں کے ایک رسالے کی اشاعت کا ڈول ڈالا۔ جو نام بھی طے کیا، پریس رجسٹرار سے نامنظور ہوا۔ کسی کے منہ سے نکلا 'بچوں کے رسالوں کے نام ہی عُنقا ہو گئے ہیں!' محسن کو جانے کیا سوجھی، یہی نام بھیج دیا۔ طُرفہ تماشا یہ کہ '**عُنقا**' (بچوں کا ڈائجسٹ) منظور بھی ہو گیا۔ لڑکپن کے عہد کے ایک رسالے میں لکھنے، اسے ترتیب دینے، کتابت کرانے، چھپوانے سے لے کر بکوانے تک کے وہ جھمیلے اب تک یاد ہیں۔ چند شماروں کے بعد تھک ہار کر ہم لوگوں نے سپر ڈال دی اور وہ رسالہ اسم بامسمّا یعنی واقعی عنقا ہو گیا۔

شیطان کی آنت کی طرح طویل محمد علی روڈ پر مشہور زمانہ ناشران و تاجرانِ قرآن '**تاج آفس**' کے مقابل '**شرف الدین الکتبی**' سے لگی کشادہ فٹ پاتھ پر اُس دور میں **مولانا مومن اینڈ سنس** پرانی کتابوں اور رسالوں کا عظیم الشان ذخیرہ پھیلائے بیٹھے نظر آتے تھے، شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شرف الدین الکتبی نے بعد میں قدم رنجہ فرمایا، مولانا مومن کی کتاب نگری وہاں پہلے سے آباد تھی۔ اسی فٹ پاتھ پر ہمارا سابقہ پہلی بار **گرگ اینڈ کو** اور **پنجابی پُستک بھنڈار** کی تخیل کی کرشمہ سازی اور طلسم کی ہوش رُبائی کی اُن داستانوں سے ہوا، جنھوں نے کچھ عرصے کے لیے سحر زدہ سا کر دیا۔ **کل کا گھوڑا**، **چھبیلی بھٹیاری**، **وکرم بیتال**، **فسانۂ عجائب**' **چہار درویش**' **سنگھاسن بتیسی**، **گل بکاؤلی**، **گل صنوبر** اور **توتا مینا** جیسے قصّوں کا ایک فسوں ساز جہاں تھا، جنھیں پڑھ کر کوئی بھی گرد و پیش بھلا دے۔ ہمیں آج بھی یاد ہے کہ **سند باد جہازی** کو درپیش خطراتِ سفر میں سند باد سے زیادہ ہم اپنی جان ہلکان کیے رہتے تھے اور **حاتم طائی** کی اپنے وعدوں کی پاس داری میں اُٹھائے جوکھموں میں ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جایا کرتی تھی۔

وقت نے کروٹ بدلی تو ہم نے اپنے بچوں کو **گلی ور** کے سفرنامے اور **گریم** کی کہانیوں سے دل بہلاتے دیکھا اور آج کی نسل **ہیری پوٹر** کی کہانیوں پر لوٹ پوٹ ہو رہی ہے، لیکن ہمیں شک ہے جو لطف ہم نے اُٹھایا، وہ اُنھوں نے پایا ہوگا! کچھ بھی ہو، وہم و تخیل کے اُن قصوں میں ہمارے ماضی کے خوب و زشت اور پست و بلند کے کچھ نہ کچھ عناصر قلبِ ماہیئت کے ساتھ ضرور گھُلے ملے ہوئے تھے.... ہر نوعمر باکرہ حسینہ کے عشق میں اپنی تجارت کو کھوکھلی کر دینے والے سوداگر زادے، آسمان میں تھگلی

لگانے والی گُٹنیاں، تریا چرتر، نرد کی بازی پر لُٹتی سلطنتیں، خوش غلاف کنیزیں، دل پھینک شہزادے، سازشی وزرا، خوشامدی اُمرا، جاں نثاریاں و دغابازیاں، دوستی و عناد، عروج و زوال، سحر اور ردِ سحر غرض کہ رنگا رنگ جھلملیوں کا نگار خانہ سستے اخباری کاغذ پر زرد رنگ کے ایک تصویری سرورق کے ساتھ چھپا، چند آنوں میں کھُلے عام فٹ پاتھ پر دستیاب تھا۔

یہیں سے ہمیں **فیروز سنز لیمیٹیڈ** اور **شیخ غلام علی اینڈ سنز** (لاہور) کی کتابیں ہاتھ لگیں۔ اُن میں سے **مقبول جہانگیر** کی شکار بیتیوں اور **سعید لخت** کی پُر لطف کہانیوں کے نقوش ذہن سے آج بھی مٹے نہیں ہیں گو دُھندلا ضرور گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے یہیں سے **مکالماتِ افلاطون** اور **حکایاتِ بید پائے** سے حکمت کے موتی چُنے، اور '**ھند پاکٹ بُکس**' اور '**اسٹار پاکٹ بُکس**' کے منی ایچر زکی تنکنائے کے ذریعے اردو ادب کے بحرِ ذخّار کی شناوری کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

آج اُس ساری گزرگاہ (فٹ پاتھ) کو مولانا مومن کے گرینڈسنس اور دوسرے ہاکروں نے ربر اور پلاسٹک کے جوتوں، چپّلوں کا بازار بنادیا ہے۔ شرف الدین بھی الکتبی نہیں رہا، پاپوش ہو چکا ہے۔ اکبرالہٰ آبادی نے اپنے زمانے میں کہا تھا:

بوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے ایک مضمون لکھا
شہر میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ایک صدی بعد بھی اکبر کے قول کا عملی مشاہدہ آپ اس فٹ پاتھ پر سے گزرتے ہوئے کرلیں گے، جب جوتوں اور چپّلوں کے ڈھیر میں سے آپ کا پیدل چلنا دشوار ہو جائے گا اور ذرا غور فرمائیں گے تو ڈاسن کا جوتا آج بھی ہر جگہ چلتا ہوا نظر آئے گا۔ ملک کی پارلیمنٹ کے منتریوں ہی پر نہیں امریکا کے جارج بُش کے منہ پر بھی، اور اکبر کا مضمون بدستور کتابوں میں منہ چھپائے ملے گا۔

کرشن چندر کی تحریر کے جادو سے ہم '**چڑیوں کی الف لیلہٰ**' سے متعارف ہو چکے تھے، بعد میں اُن کے بچوں کے لیے لکھے دوسرے ناول بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھ لیے: '**ستاروں کی سیر**'، '**خرگوش کا سپنا**'، '**لال تاج**'، '**اُلٹا درخت**' اور آخر میں بچوں کی مہم جوئی پر لکھا اُن کا ناول '**ھمارا گھر**'، جس پر بعد میں خواجہ احمد عباس نے فلم بھی بنائی تھی۔ عصمت چغتائی نے اپنے مزاحیہ ناول '**تین اناڑی**' میں تو جیسے کلّو، بیلو اور ٹیٹو کی شکل میں ہمارے اور آپ کے گھروں کے جیتے جاگتے کردار پیش کر دیے تھے۔ اُن تین اناڑیوں کی شرارتوں، بیچارگیوں اور اپنے متّن بھیا کے ہاتھوں اُٹھائی زک کا گڈمڈ خاکہ اب بھی ذہن کے کسی گوشے میں کھنچا پڑا ہے۔

عہدِ طفلی کے ادب میں دو ناولوں نے ہمارے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ہمیں زندگی کے بارے میں سوچنے سمجھنے کی ایک سمت مہیا کی۔ پہلا '**اُلٹا درخت**' جس کی شاخوں میں نت نئے نگر بسے تھے۔ اُن میں کہیں حریصوں کی بستی میں انسانوں کے خون سے سینچ کر زر و جواہر کی کھیتی کاٹی جارہی تھی، کہیں انسان کی ترقیِ معکوس کا یہ نظارہ تھا کہ مشینوں کے غلبے نے انسان ہی ختم کر دیے تھے۔ کہیں اقتدار اور خود غرضی کے سانپ پھن پھیلائے بیٹھے تھے۔ کہیں جادوگروں کو اپنے پاکھنڈ برقرار رکھنے کے لیے الیکشن لڑنا پڑ رہا تھا۔ اس عجیب و غریب ناول نے ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا اور روایتی طرز کے بے معنی قصّوں سے طبیعت ہٹنے لگی۔

دوسرا ناول '**جن حسن عبدالرحمان**' جو اصلاً روسی ہے۔ اُس کے انگریزی (ایل لاگن) سے اردو میں کیے گئے

ترجمے کی اولین اشاعت کے ناشر **مکتبہ جامعہ لمیٹڈ** نے مترجم کا نام دینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے کہ مکتبہ کے جنرل مینجر (!) غلام ربّانی تاباں نے اُن سے کہا تھا کہ 'ترجمے کی کتاب پر اُن کے نام کی ضرورت ہی کیا ہے!' تب قرۃ العین حیدر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا، اس لیے وہ 'بوجوہِ مروّت و اخلاق' خاموش رہ گئی تھیں۔ (جب وہ اپنی شہرت کے نصف النہار پر پہنچیں تو اس ناول کے دوسرے اڈیشن میں مکتبہ نے مترجمہ کا نام چھاپنا اپنے لیے سود مند سمجھا تھا۔اسیم) دوجلدوں پر مشتمل یہ ناول ایک ہونہار، بلند ہمّت اور راست باز روسی بچے وولکا کی کہانی ہے، جس کے حق میں اُس کے دوست جن 'حسن عبدالرحمان حطا بچ' کی عنایت، نوازش اور مہربانی قدم قدم پر زحمت اور پریشانی کھڑی کردیا کرتی ہے۔ یہ سائنس فکشن بیسویں صدی کے انسان کی فہم و فراست اور سائنسی ترقیوں کے سامنے جن، دیو، پری کے محیرالعقل کارناموں کو واہمۂ خیال ہی ثابت نہیں کرتا بلکہ چیلنج پیش کرتا ہے کہ اگر وہ واقع بھی ہوجائیں تو انسانی علم و دانش کے سامنے ڈھیر ہو کر رہ جائیں گے۔ ناول کا یہ اختتام تو بھلائے نہیں بھولتا کہ جن حسن عبدالرحمان حطا بچ، جس نے کبھی وولکا کو جغرافیہ اور سائنس کے امتحان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کے نصاب سے مدد فراہم کر کے مشکلات میں مبتلا کردیا تھا، وہی حطا بچ، وولکا کی اسکول میں نئے دور سے ہم قدم ہونے کے لیے داخلہ لے رہا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس ناول کو ہمارے مدرسوں کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔

مختصر یہ کہ نئے عہد کی بشارتوں والے ان ناولوں نے ہمارے ذہن میں موجود، روایتی داستانوں کے بادشاہوں کے جاہ و حشم اور جادوگروں کے سحر و طلسم کے بچے کچھے اثرات بھی درہم برہم کر کے رکھ دیے۔ سلیمانی ٹوپی کاغذ کی نکلی، الہٰ دین کے چراغ سے اپنا بجلی کا لیمپ بھلا لگنے لگا اور جمہور کی سلطانی کے خواب آنکھوں میں سمانے لگے۔

ممبئی کے کرافورڈ مارکیٹ کے ایک طرف جو اب منیش مارکیٹ ایستادہ نظر آتا ہے، اُس دور میں وہاں 'ریڈیو سینما' ہوا کرتا تھا۔ اُس سے ملحق گلی کے نکڑ پر 'گلشن' کا کاروبار آج بھی چل رہا ہے۔ اسی 'گلشنِ ایران ہوٹل' سے لگ کر '**عبدالقادر بُک ایجنسی**' ہوا کرتی تھی۔ اُس کے مالک موٹے تگڑے قادر بھائی، ممبئی میں ہندستان بھر کے اردو اخبارات اور رسائل کے سب سے بڑے تقسیم کار تھے۔ اُن کی دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر دو چار ریلوے پارسل کھلنے کے انتظار میں ہمیشہ پڑے ملتے تھے۔ ہماری رہایش اگرچہ محمد علی روڈ کے تاجرانِ کتب کی دُکانوں سے قریب تھی، لیکن ہم کوئی ایک کلومیٹر چل کر اپنی پسند کے رسالے اور ڈائجسٹ، ان پارسلوں کے کھلتے ہی وہیں سے لے آتے تھے کہ کتابوں کی دکانوں تک اُن کے پہنچنے کا انتظار کون کرے! اُن دنوں '**شمع**' نے ش سے '**شبستان**' ڈائجسٹ نکالا تھا اور '**ھُما**' نے 'ہ' سے '**ھدیٰ**'، '**ھدف**'، '**ھزار داستان**' اور '**اداکار**' **اور** '**واقعات**' نجانے کیا کیا جاری کر رکھا تھا۔

ناولوں کا چسکا لگ چکا تھا، پھر سراج انور کے '**خوفناک جزیرہ**'، '**کالی دنیا**' اور '**نیلی دنیا**' جیسے تحیّر، اسرار اور اڈونچر بھرے ناولوں سے تو جیسے اُن کی لت ہی لگ گئی۔ دوستوں کی شہ پر ابن صفی کے دس پندرہ ناول پڑھنے میں آئے۔ ہم اُنھیں خالی پیریڈ اور وقفے (break) میں پڑھنے کے لیے، درسی کتابوں میں چھپا کر سکول لے جایا کرتے تھے۔ ایک دن اُستاد کی نظر پڑ گئی۔ اُنھوں نے جاسوسی ناولوں کو مخرّبِ اخلاق قرار دے کر ان کا مطالعہ ترک کرنے کے لیے کہا اور ہم نے سرِ تسلیم خم کرلیا۔ ادھر انگریزی کے مشہور ناولوں کے **مظہر الحق**

علوی اور **ایم جے عالم** کے ترجمے 'تاج آفس' سے ملحق ممبئی کی معروف '**شمع لائبریری**' میں دستیاب ہونے لگے تھے۔ '**ظلِّ ہُما**'، '**ڈراکیولا**'، '**تیغ زن**'، '**فرینکسٹائن**'، '**ٹائم مشین**'، جیسے ضخیم ضخیم ناولوں کا ایک سیلاب رواں تھا اور شوق و تخیل کی دل بستگی کے لیے کہیں زیادہ وسیع اُفق حاصل ہو چکے تھے۔ پھر ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اگر چہ پتا تھا کہ الہٰ آباد/دہلی سے جاسوسی ہی نہیں تاریخی، طلسمی اور رومانی دنیا کے ناول بھی نکلتے ہیں، پر طبیعت اُدھر نہیں آئی۔

برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ تنہا ایک '**ادارۂ شمع**' نے اپنے مقبول عام جریدوں کے ذریعے جس طرح گھر گھر اردو کی روشنی پھیلا رکھی تھی اور اپنی (تقریباً) ساٹھ سالہ مدتِ عمر میں جس لگن اور استقلال کے ساتھ اردو کی غیر اعلان شدہ خدمت انجام دی تھی، اُس کا عشرِ عشیر کام بھی اردو کی ترقی کے اعلان کے ساتھ قائم ہماری ریاستی اکاڈمیاں اور انجمنیں کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ فلمی جریدے '**شمع**' کا سا عروج تو شاید ہی کسی اردو جریدے کو حاصل ہوا ہو، اس کے علاوہ ہفت روزہ '**آئینہ**' جیسا ادبی، سیاسی اور ثقافتی جریدہ بھی ہند میں اردو میں پھر کبھی نہ نکل سکا۔ (لاہور سے اسی پایے کا ہفت روزہ '**لیل و نہار**' البتہ شائع ہوا کرتا تھا)، اسی طرح ماہ نامہ '**بانو**' (جو گھر میں ہماری بہنوں کے لیے آیا کرتا تھا) کے معیار کو بھی خواتین کا کوئی جریدہ نہیں پہنچ سکا۔ آج جن '**شہناز**' کے نام کی عالمی درجے کی مصنوعاتِ حسن مشہور ہیں، اپنے ابتدائی دور میں انھوں نے '**بانو**' کے '**بیوٹی کالج**' کالم ہی کے ذریعے اپنی حسن افزا ہُنر مندیوں کو متعارف کرایا تھا۔ اب چاہے جو بھی عوامل رہے ہوں، مثل مشہور ہے: ہر کمالے را زوالے، **ادارۂ شمع** کی زندگی کے ربعِ آخر میں یکے بعد دیگرے اس کے جریدے بند ہونے لگ گئے تھے اور بیسویں صدی کے جاتے جاتے وہ جو بچتے تھے دوا ے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے اور پھر لوگوں نے دیکھا، اِک '**شمع**' رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش تھی!

'**ادارۂ شمع**' کا اُٹھ جانا اردو دنیا کا ایک نا قابلِ تلافی نقصان تھا، لیکن دیکھا گیا ہے کہ زمانہ تلافیِ مافات کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتا ہے۔ اُسی دور کے آس پاس حکومت ہند کا سابق ادارہ '**ترقی اردو بورڈ**' ایک نئی تاب و توانائی اور بلند حوصلوں کے ساتھ 1996ء میں '**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**' کے روپ میں میدانِ عمل میں نظر آیا۔

'**قومی کونسل**...' نے پچھلے سولہ سترہ برسوں☆ میں صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے علمی و ادبی کتابوں کا جو گراں قدر خزانہ اردو داں طبقے کے لیے پیش کیا ہے، اُس کی تفصیل کے لیے بجائے خود ایک مقالہ درکار ہے۔ اس کے ساتھ ہی **کونسل** نے جہاں، اپنے فلیگ شپ مجلّے '**اردو دنیا**' کو ہر دل عزیز بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، وہیں سنجیدہ طبع قارئین کے لیے '**فکر و تحقیق**' کا بھی ایک اچھا معیار قائم کیا ہے۔ حال ہی میں **کونسل** کے باغ کے نہالِ تازہ یعنی '**بچوں کی دنیا**' کے ابتدائی چند شمارے ہم دست ہوئے ہیں اور یہ اُنھیں کا جادو ہے جس نے ہمیں اپنے عہدِ طفلی میں جھانکنے اور یہ صفحات لکھنے پر مجبور کر دیا۔ '**بچوں کی دنیا**' میں آج کے عہد کے بچوں کی ذہنی تفریح، تعلیم اور دل چسپی کا سارا سامان موجود ہے۔ تصاویر و طباعت کی دل کشی اور حسن ترتیب بھی ہر اعتبار سے عالمی درجے کی ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ '**بچوں کی دنیا**' کو برسوں پہلے جاری کر دیا جانا چاہیے تھا۔ ضرورت ہے کہ ملک بھر میں جہاں بھی اردو کے مدارس اور اسکولیں ہیں، '**بچوں کی دنیا**' بڑی تعداد میں وہاں تک پہنچے۔

چلیے، اب ہم اپنے اسکولی دور کے آخری دنوں کا سرا پکڑیں۔

مہاراشٹر اسٹیٹ ایس ایس سی بورڈ (اُس وقت کی گیارھویں) کا رزلٹ برائے مارچ1970ء اخباروں میں آیا تو یہ خبر بھی چھپی کہ ہم نے ریاست بھر میں اردو زبان میں سب سے زیادہ نمبر لیے ہیں۔ اُستادِمحترم مولانا جالب مظاہری (سہسرامی) اپنی انتیس سالہ ملازمت کے دور میں اپنے اسکول (**اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول، بمبئی**) کو اردو کے سات اور فارسی کے پانچ گولڈ میڈلسٹ دے چکے تھے۔ اپنی سبک دوشی کے برس میں ایک بار اپنی محنت کو پھر رنگ لاتے دیکھ کر کھِل اُٹھے۔ اُنھوں نے اسکول چھوڑی، لیکن ہم نے اُنھیں نہیں چھوڑا، اور کئی برس تک اُن کے دانش کدے پر جا کر فارسی کا درس لیتے رہے۔ مولانا محمدحسین آزاد کی **انجمن حمایت اسلام** (لاہور) کی فارسی ریڈروں سے ازسرِنو ابتدا کی، پھر '**گلستاں**'، '**بوستاں**'، '**اخلاقِ محسنی**'، '**یوسف و زلیخا**' (جامی)، '**پنج رقعہ**'، نجانے کہاں تک پہنچے!

یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ہمارے گہوارۂ علم (ہائی اسکول) کی لائبریری میں اُستادِمحترم کی ذاتی کوششوں سے اردو کے ادبِ عالیہ کا گراں قدر خزانہ جمع تھا۔ وہیں پر ہم نے اردو کے عناصرِ خمسہ (**سرسید، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالی، علّامہ شبلی اور نذیر احمد**) کی تصنیفات کو بقدرِ فہم چُن چُن کر پڑھا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ہی دور میں ان بزرگوں نے ہماری زبان میں انشا، تاریخ، تنقید، سوانح، ناول اور جدید نظم کے کیسے بھرپور اور تابندہ نقوش قائم کر کے اسے کتنا ثروت مند بنا دیا تھا۔

اسکولی دور ختم کرنے کے بعد جب ہم **مہاراشٹر کالج** (بمبئی) میں فرسٹ ایر میں تھے، ایک دن کالج کے سامنے کی فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کا انبار لگائے ایک سفید پوش، فرنچ کٹ ڈاڑھی والے نستعلیق سے بڑے میاں کی شناسا صورت نظر آئی۔ یہ سال ڈیڑھ سال پہلے بمبئی کے '**ناگپاڑہ نیبر ہڈ ہاؤس**' سے ملحق فٹ پاتھ پر اپنا ٹھیّا لگایا کرتے تھے اور ہم '**نگار**'، '**مخزن**'، '**ساقی**'، '**نیرنگ خیال**' اور '**نقوش**' جیسے ادبی رسالوں سے اُن کے ٹھیّے ہی پر متعارف ہوئے تھے، پھر نجانے وہ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے، اب جو ہاتھ آئے تو اُن سے پہلے کی طرح پھر سلسلہ جُڑ گیا۔

کچھ مدت بعد ہم نے اُن کے پاس نیاز فتح پوری کے مشہور زمانہ جریدے '**نگار**' کی آغازِ اشاعت سے لے کر بیس پچیس برسوں تک کی جلدوں کا ذخیرہ دیکھا تو حیران رہ گئے، اُنھوں نے بتایا کہ وہ ذخیرہ اُنھیں **محمود سروش** (بمبئی کے مشہور رضوی برادران میں سے ایک بھائی، جو ایک اچھے سخن ور اور صاحبِ ذوق شخص تھے۔) سے حاصل ہوا ہے، جنھوں نے دہلی میں **جامعہ ملیہ اسلامیہ** میں کوئی منصب سنبھالنے کے لیے بمبئی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ بڑے میاں نے ہمارا اشتیاق دیکھ کر اُن فائلوں کے دام بھی کچھ گراں کر دیے تھے۔ ایسے وقت میں ہماری والدہ محترمہ نے جو اگرچہ معمولی پڑھی لکھی ہیں، لیکن جانتی ہیں کہ اُن کے بیٹے کو کتابوں کے مطالعے کے علاوہ کوئی اور شوق نہیں، ہمیں چند ہزار کی مطلوبہ رقم عنایت کی اور ہم وہ علمی خزانہ گھر اُٹھا لائے۔ چند برس قبل بمبئی کے ایک پُرانے کتب فروش نے اثنائے گفتگو میں یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ بڑے میاں فلم ایکٹریس ممتاز کے والد تھے، چوں کہ اُنھیں اپنی ایکٹریس بیٹی کی کمائی منظور نہیں تھی (جو اُس زمانے میں C گریڈ کی فلموں میں دارا سنگھ کی ہیروئن بن کر آیا کرتی تھی) وہ اپنا گزارا اس طرح کتابیں بیچ کر کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم....

میری اس تحریر کا مقصد اپنے عہدِ طفلی کے ادب کا ذکر کرنا تھا،لیکن بات کا سرا آگے سرک گیا۔اُس کے بعد مطالعے کے شوق میں کہاں کہاں کی خاک چھانی! قدیم ادبی رسائل کی فائلوں اور کم یاب ادبی کتابوں کی تلاش نے کیسے کیسے کنوئیں جھنکوائے،ان کا ذکر پھر کبھی،اور اب تو خیر، لکھنے پڑھنے کے آداب ہی بدل گئے ہیں۔ ڈیجیٹل لائبریریوں اور آن لائن کتابوں کی ایک نئی دنیا آباد ہے اور نت نئے علوم کی شاخ در شاخ وسعتوں کا کوئی اور ہے نہ چھور!

ماہ اپریل 2013 ء میں بمبئی کے اردو روزنامے '**اردو ٹائمز**' کے ادبی صفحے کے مرتب ندیم صدیقی صاحب نے ادب دوستوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ 'اُنھیں اپنی ساری زندگی میں کس کتاب کے مطالعے نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟' اور اس کے جواب کی فرمایش کی تھی۔راقم نے اپنے جواب کی تمہید میں لکھا تھا:

''یہ تو زمانے کا زور اور حالات کا جبر ہے، جس سے انسان زیروزبر ہوتا رہتا ہے۔اگر کتابوں کا انسانی زندگی پر کوئی دیرپا یا دائمی اثر ہوتا تو... '**تری پیٹیکا**' کو مقدس سمجھنے والے،اہنسا کے مدّعی بدھشٹ میںنمار میں مسلمانوں کا قتلِ عام نہ کر رہے ہوتے۔ اسلام کو امن وسلامتی کا دین اور '**قرآن**' کو حرفِ آخر سمجھنے والے مسلمان،اسلامی ملکوں میں اپنے بھائی بندوں ہی کا خون نہ بہا رہے ہوتے۔اپنے باپ کی بزرگی اور عہد کی پاس داری میں بن باس قبول کرنے والے رام کی '**رامائن**' کے معتقد ہندوؤں میں اپنے بوڑھے والدین کو بے گھر کرنے،کمبھ کے میلے یا بنارس میں جا چھوڑنے کے دل دوز واقعات سب سے زیادہ نہ پائے جاتے،اور **انجیل** پر ایمان رکھنے والے عیسائی،حضرت عیسا کے اس پیغام کو بھول کر کہ 'اگر کوئی تمھارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال پیش کردو'، گوانتانا موبے میں بغیر ٹرائل کے بے گناہوں کو ٹھونس کر، کہیں ڈرون حملے کر کے، کہیں حکومتوں کے تختے پلٹ کر دنیا بھر میں اپنی دہشت گردی کا تانڈو ناچ نہ دِکھا رہے ہوتے۔''

اب غور کرتا ہوں کہ یہ زمانہ تو خود ہمارے علم وعمل کا عکس ہے،اُسی کا پیدا کردہ ہے۔

کیا ہمارے داناؤں نے یہ نہیں کہا ہے کہ علم کا مقصد شعورِ ذات ہے اور شعورِ ذات کے اِمکانات کو روبہ عمل لانے کا حاصل، عالمِ موجودات ہے۔اگر ہمارے شعور وفہم اور علم وعمل نے عالمِ موجودات کو یہ صورت بخشی ہے تو اس حاصلِ نتیجہ پر آج کے ایک شاعر نے کیا غلط کہا ہے! ؎

کس درجہ ہولناک ہے یارو شعورِ ذات
کتنی حسین پہلے یہی کائنات تھی!

جب ہم دیکھتے ہیں کہ علم کی بہتات اور بوجھ تلے آدمی دبتا چلا جا رہا ہے،لیکن اس کے من کا خلا کم نہیں ہوتا۔براعظموں کے فاصلے سمٹتے جا رہے ہیں لیکن انسان سے انسان کی دُوریاں مٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ نو بہ نو ایجادات اور خوب سے خوب اشیاے زندگی کا ریلا ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا، جو گراں بہا ہیں، لیکن انسانی زندگی بے قیمت ہے اور لاکھوں لوگ بنیادی وسائلِ حیات تک سے محروم ہیں۔قوانین پر قوانین وضع ہوتے جا رہے ہیں،لیکن جرائم اور بدعنوانیوں کا سدِّ باب نہیں ہو پاتا۔ایک طرف انسان مریخ و ماہتاب کی تسخیر میں کوشاں ہے، دوسری طرف رنگ، نسل، زبان اور مذہب کے تعصّبات کے ہاتھوں ہو رہی ہلاکتیں رکنے کا نام نہیں لیتیں۔۔۔۔۔۔۔تو عروجِ آدم اور زوالِ آدمیت کے یہ نظّارے دیکھ کر دل سہم سہم جاتا ہے اور لگتا ہے کہ ہمارے علم و دانش کا سفینہ بحرِ زندگانی کے طوفانِ حوادث میں ایک کاغذ کی کشتی کی طرح ڈول رہا ہے۔کیا کاروبارِ مشیّت کے آگے انسان واقعی ایک طفلِ ناداں ہے اور اُس کا دفترِ علم کاغذ کی ایک کشتی!

OOO

وسیم بیگم

مضمون

مابعد جدیدیت، نئی فکریات اور بنیادی تبدیلیاں (پہلی قسط)

زبان اور تحریر میں جدلیاتی رشتہ ہے دوسرے لفظوں میں زبان تہذیب کا چہرہ ہے۔ تہذیب بھی زبان کی تشکیل وتعین کرتی ہے۔ زبان سے انسان کے ارتقائی عمل میں سب سے بڑا بھید ہے۔ چونکہ یہ سماج اور ادب زبان سے تشکیل پاتا ہے ادب اول وآخرت ایک سماجی عمل ہے جو ہمہ وقت انسان کی فلاح اور بہتری کا خواب دیکھتا ہے۔ مابعد جدیدیت کا مرکزی ایجنڈا ادبی شرائط کا لحاظ کرتے ہوے سماجی وثقافتی سروکار ہے۔

جب کبھی کسی بھی زبان کے ادب میں کوئی نئی ادبی تحریک وجود میں آتی ہے، وہ ادب میں آنے والے Stagnation یا جمود کو توڑ دیتی ہے۔ادب میں وقت اور حالات کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح ایک خاص وقت گزر جانے کے بعد ایک ادبی تحریک کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری ادبی تحریک لے لیتی ہے۔ اگر بدلاؤ کا یہ عمل ادب میں جاری وساری نہ رہے نیز ہماری سوچ، تصورات، خیالات، طرز زندگی میں مختلف اوقات کے اندر کوئی تبدیلی رونما نہ ہو تو نئے افکار و نئے تصورات بھی جنم نہ لیں۔ ادب میں تکرار کی وجہ سے نہ تو کوئی گرمی رہے گی نہ حرارت، اس طرح کا ادب بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ وہ ایسا جسم بن جائے گا جس میں روح نہیں ہوگی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون 'کیا آگے راستہ بند ہے' میں اس تبدیلی کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے:

> ''ادب بھی زندگی کی طرح ایک سفر ہے، عہد بہ عہد، منزل بہ منزل، جس میں حالات بدلتے ہیں، ترجیحات بدلتی ہیں، رویے بدلتے ہیں، لوگ بدلتے ہیں، تقاضے بدلتے ہیں، فضا بدلتی ہے، مناظر بدلتے ہیں۔ ادب بند گلی نہیں۔ تبدیلی جس طرح زندگی میں ناگزیر ہے، ادب میں بھی ناگزیر ہے۔ اس کو سب مانتے ہیں، اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ تبدیلی پچھلے پندرہ بیس سال سے ہو چکی ہے، خاصی ہو چکی ہے، اس وقت بھی لحظہ بہ لحظہ ہو رہی ہے، صرف اردو میں نہیں تمام زبانوں میں ہو رہی ہے، تخلیقی رویے بدل چکے ہیں، سچویشن بدل چکی ہے، ادب کی فضا، ادب کا مزاج اور حسیت بدل چکی ہے، بدل رہی ہے۔ آج جس طرح ادب لکھا جارہا ہے وہ پہلے کے ادب سے مختلف ہے''۔ (جدیدیت کے بعد، ص85)

ہم جس دور میں جی رہے ہیں یہاں بڑی تیزی کے ساتھ Globlization ہو رہا ہے۔ دنیا سکڑتی اور سمٹتی جارہی ہے۔ سائنسی اور ٹکنالوجیکل ترقی ہو رہی ہے۔ اس لئے ہم گھنٹوں اور منٹوں میں بہت سی تبدیلیوں سے واقف ہو جاتے ہیں، مختلف زبانوں کے ادب میں کون کون سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس کی اطلاع ہمیں پلک جھپکتے ہی مل جاتی ہے۔ ان حالات میں اگر ہم ان تبدیلیوں کا اثر قبول کرنا نہ چاہیں اور یہ سوچ لیں کہ جو کچھ پرانے زمانے سے ہوتا چلا آرہا ہے وہی سب درست ہے اور جو نئے افکار، نئے تصورات وجود میں آرہے ہیں وہ سب بے معنیٰ ہیں اور ہمیں کسی ادبی، غیر ادبی تحریک یا رجحان سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم خود ہی اپنے ادب کو پسماندہ رکھنے کے حق میں ہیں لیکن یہ اچھا فعل ہے کہ اردو شعر وادب میں ایسا نہیں ہو رہا

ہے۔

سامنے کی بات ہے کہ سرسید تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت نے اپنے ماحول اور تقاضوں کے لحاظ سے بہت کچھ دیا۔ عام طور پر ہر تحریک اپنے اندر کچھ مثبت پہلو ضرور رکھتی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کے کچھ منفی اثرات بھی ادب میں مرتب ہوتے ہیں لیکن وہ تحریک یا رجحان ہمارے لئے اس لئے اہم ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے ادب میں آیا ہوا Stagnating Point ٹوٹتا ہے اور بات کو اپنے طور پر آگے بڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے فکر و خیال میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہی ادب کے لئے بہت ضروری ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جدیدیت اپنا کام بخوبی انجام دے چکی۔ اس کے تحت آنے والے تصورات جیسے تنہائی، فلسفہ، وجودیت، تشکیک، تلخی، اداسی، تشخص کا مسئلہ ایسے مسائل ہیں جو شعر و ادب میں جگہ پاچکے۔ اب ہمیں دوبارہ اپنے حالات وواقعات پر گہرائی کے ساتھ نظر ڈالنی ہوگی، تبھی ہم ان جدید خیالات کے جھمیلے سے اپنے آپ کو باہر نکال سکیں گے اور اگر انھیں پر اکتفا کر کے بیٹھے رہیں گے تو پھر ادب میں سوائے تکرار کے کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ہمیں اپنے زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے تبدیلی لانا ہوگی۔

مابعد جدیدیت کے زیر اثر مغربی ادب کے ذہن وافکار میں جو تبدیلی بہت پہلے آچکی ہے اس کے اثرات کو مشرقی ادب نے بھی 1980 کے آس پاس قبول کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں جیسے کنڑ، ملیالم، تیلگو، بنگالی، ہندی، پنجابی، اور مراٹھی وغیرہ کے ادب میں مابعد جدیدیت کی لہر کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان نے اس کے اثرات کو نسبتاً مابعد جدیدیت کسی ایک نظریے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس میں مختلف ذہنی رویے اور تصورات شامل ہیں۔ اس طرح اگر غور کریں تو اس کی بنیاد دو باتوں پر قائم ہے۔ ایک تو فنکار کو تخلیق کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ دوسرے کسی بھی لفظ کے معنی الگ الگ سطح پر مختلف ہو سکتے ہیں اور وہ لفظ کسی بھی ایک معنی کا پابند ہو کر نہیں تخلیق کیا جائے گا بلکہ قاری کو اس بات کی پوری آزادی ہو کہ وہ اپنی سوچ کے مطابق اس کے معنی کو تہہ تک پہنچ سکے۔ مابعد جدیدیت خود جدیدیت کے بعد کی ایک نئی صورت حال ہے۔ اس لئے یہ دور مابعد جدیدیت دور کہلائے گا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت کی وضاحت بڑے سلیس انداز میں اس طرح کی ہے:

> ''جدیدیت کے بعد کا دور مابعد جدیدیت کہلائے گا لیکن اس میں جدیدیت سے انحراف بھی شامل ہے جو ادبی بھی ہے اور آئیڈیولوجیکل بھی۔ آئیڈیولوجی سے یہاں مراد کوئی فارمولا یا کسی سیاسی پارٹی کا منصوبہ بند پروگرام نہیں بلکہ ہر طرح کی فارمولائی ادعائیت سے گریز یا تخلیقی آزادی پر اصرار یا اپنے ثقافتی تشخص پر اصرار بھی ایک نوع کی آئیڈیولوجی ہے''۔

(ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص609)

مابعد جدیدیت کو اردو دنیا والوں کے لئے سمجھنا اس لئے زیادہ مشکل ہو گیا ہے کہ ابھی تک ہمارے ذہن ترقی پسندی اور جدیدیت کی گرفت سے باہر نہیں آسکے ہیں۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت دونوں ایک دوسرے کے ضد تھیں۔ ترقی پسند تحریک میں جس آئیڈیولوجی پر زور دیا تھا جدیدیت اس کی مخالف تھی۔ اس میں زیادہ زور شخصیت کے بکھراؤ پر تھا جب کہ ترقی پسندی کی بنیاد اشتراکیت پر استوار تھی۔ اس میں کسان، مزدور اور نچلے طبقے پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج تھا۔

مابعد جدیدیت کی کوئی نظریاتی یا فارمولائی تعریف نہیں کی

جاسکتی کیوں کہ یہ تو ایک ایسا ذہنی رویہ ہے جس میں فنکار کی تخلیق آزادی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس ثقافتی تشخص کی بات کہی گئی ہے جس سے اب تک ہمارے فنکار رجدا رہے۔ادب میں چونکہ اس سے پہلے تہذیب وثقافت پر پوری طرح توجہ نہین دی گئی تھی اور ہمارا ادب اپنی جڑوں سے ایک معنی میں بالکل کٹ کر رہ گیا تھا اس لئے تہذیبی تشخص پر زیادہ اصرار کیا گیا۔سچائیاں ایک نہیں ہیں زمانے اور حالات کے مطابق ان کا اظہار مختلف زاویوں سے ہوسکتا ہے۔مقامیت کو زیادہ اہمیت سمجھنے پر زور دیا گیا۔کوئی بھی سوسائٹی اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے کوئی بھی زبان استعمال کرسکتی ہے جس کو متعلقہ سوسائٹی آسانی سے سمجھ سکے۔ اس میں نئے سرے سے سماجی اور تہذیبی مسائل پر زیادہ توجہ مبذول کی جانی چاہئے۔کسی بھی متن میں معنی دو طرح سے سامنے آتے ہیں۔ایک تو وہ معنی ہوتے ہیں جو اس عبارت یا شعر کو پڑھنے کے بعد فورا سامنے آجاتے ہیں، دوسرے وہ معنی ہوتے ہیں جو بہت سوجھ بوجھ کے بعد ذہن کی سطح پر ابھرتے ہیں۔قاری کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ متن کے اصل معنی تک پہنچ سکے اور یہ بتا سکے کہ شاعر یا ادیب اپنی تخلیق میں کیا کہنا چاہتا ہے۔اس لئے مابعد جدیدیت میں قاری کی اہمیت پر زیادہ زور دیا گیا۔اس کے علاوہ اس میں کسی سیاسی نظریے کے تحت کوئی ایسا فارمولا نہیں تیار کیا گیا کہ اگر شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات میں اس طرح کے خیالات اور تصورات تخلیق کرے گا تو مابعد جدید ہوگا ورنہ اس کو تحریک سے باہر سمجھا جائے گا۔ اس میں ایسا کوئی فلسفہ موجود نہیں ہے جو تخلیق کار کے لئے کسی قسم کا ہدایت نامہ جاری کرے اس میں کسی بھی قسم کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا گیا اور نہ اسے کسی دوسرے پر غیر ضروری طور طریقے سے مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت سے ادب کا رشتہ بڑے دلچسپ اور معروضی اعتبار سے جوڑا ہے:

''......ادب ہے ہی زندگی اور سماج کی اقدار کا حصہ اور ادب کی کوئی تعریف یا تعبیر زندگی، سماج اور ثقافت سے ہٹ کر ممکن ہی نہیں۔نئی ادبی فکر کی ایک بڑی دین ہے یہی کہ ادبی قدر سماجیت اور تہذیبی حوالے سے مبرا ہو ہی نہیں سکتی۔''

(ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص:611)

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کی بنیا جس ادبی فکر سے تعلق رکھتی ہے وہ دراصل ساختیات اور پس ساختیات سے ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔اگر غور سے دیکھیں تو ردتشکیل، نئی تاریخیت، مزید تحریک تانیثیت بھی اس نئی ذہنی فضا کا حصہ ہیں۔اسی وجہ سے زبان کی مرکزی اہمیت اور اس کے ذریعے معنی کیسے قائم ہوتے ہیں، متن سے متن کس طرح وجود میں آتا ہے۔ان سب مسائل پر بھی غور وفکر کے لئے نئی راہیں ہموار ہوئی ہیں۔متن سے متن کا وجود میں آنا ایک عملی صورت تو ہمیشہ رہی اور خلاصہ بحث یا اختصار کی صورت میں ایک ہی متن کو اس شکل یا اس شکل میں پیش کر دیا گیا۔تقریبا پینتیس برسوں سے معنی خیز بحثوں کا سلسلہ جاری ہے۔ان کا آغاز ہم جانتے ہیں سوسیئر کا لسان کا فلسفہ ہے۔اس کے بعد نئی تھیوری کی بحث مغرب میں جن فلسفیوں نے اٹھائی ان میں جیکب سن، لیوی اسٹراس، لاکاں، آلتیوس، رولاں بارتھ، دریدا، جولیا کرسٹیوا وغیرہ۔

وقت گذرنے کے ساتھ ہماری سوچ میں بھی ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ تصورات اور خیالات جو ہم پہلے بغیر سوچے سمجھے قبول کرلیا کرتے تھے آج ہمارا ذہن ان تصورات کو من وعن قبول نہیں کرسکتا۔ یہ ہمارے ذہنی رویوں میں بہت بڑی تبدیلی ہے۔کیونکہ وقت کے ساتھ بہت کچھ بدلا ہے۔ ہماری ذہنی سوچ ذہنی رویے ہماری فکر سب میں تبدیلی آئی ہے۔پھر ہم ان تصورات کو جوں کا توں کیسے قبول کرسکتے ہیں۔اس عہد میں

ماس میڈیا نے جس رفتار سے ترقی کی ہے، صارفیت جس طرح یلغار بن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ کمپیوٹر اور تیز رفتار ذہنوں نے ہماری تہذیبی وثقافتی ترجیحات کو الٹ دیا ہے اس سے چاروں طرف ایک ایسے بحران نے جنم لیا ہے جس کی وجہ سے ہر انسان ایک طرح کے ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ مابعد جدیدیت میں بہت سے ذہن اس تہذیبی بحران کو سمجھنے اور اس سے باہر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

عالمی سطح پر اگر نظر ڈالیں تو پچھڑے ہوئے ایشیائی، افریقی، لاطینی، امریکی یا وسط ایشیائی ممالک میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے، ان سب کی حیثیت زمانہ حال سے پہلے انسانی سماج میں دوسرے (The Other) کی تھی۔ ان کی تہذیب، ان کے ادبی ڈسکورس، اور ان کے تشخص پر توجہ مابعد جدیدیت کا ایک کارنامہ ہے۔ تانیثیت کی تحریک تو اب سے کافی زمانہ پہلے کی ہے لیکن اس کو عروج مابعد جدیدیت کے دور میں نصیب ہوا۔ ہندوستانی سماج پر اگر نظر ڈالیں تو یہاں مختلف زبانوں، مختلف مذاہب اور مختلف ذات پات کے لوگ ملیں گے لیکن اگر سیاسی منظر نامے کو غور سے دیکھیں تو برہمنوں کا غلبہ زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن اب کچھ وقت سے ان کا زور ٹوٹنا شروع ہوا ہے۔ نچلی ذاتیں یاد بے کچلے لوگ، اور نچلا متوسط طبقہ جن کی سیاست میں کوئی جگہ نہیں تھی اب آہستہ آہستہ سیاست میں اپنی جگہ بنانے لگا ہے اور اس نچلے طبقہ کو بھی اقتدار ملنے لگا ہے۔ اس طرح علاقائی اور قبائلی نیز آدی باسی کلچر نے بھی اپنی پوزیشن کو منوانا شروع کر دیا ہے اور اس کلچر نے اپنے آپ کو Main Stream سے بھی جوڑا ہے اور اس کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو منوایا بھی ہے۔ قومی منظر نامہ بھی بہت کچھ بدلا ہے۔ کچھ وقت سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مرکزی پارٹیاں بھی کمزور پڑ گئی ہیں۔ مرکز کے مقابلے میں مقامی وعلاقائی پارٹیاں نسبتاً زیادہ برسر اقتدار آ رہی ہیں۔ علاقائی لیڈر شپ بھی زیادہ ابھری ہے نیز سیاسی وثقافتی طاقتوں پر علاقائی لیڈر شپ قابض ہوگئی۔ سماج میں یہ تمام تبدیلیاں اسی منظر نامے کا حصہ ہیں اور مابعد جدیدیت کے زیر اثر ظہور پذیر ہوئیں۔ دلت ادب کی تحریک جو بعض ہندوستانی زبانوں میں پچھلی کچھ صدیوں سے جاری ہے دیسی واد (Nativism) کی جو تحریک پچھلے چند برسوں میں شروع ہوئی ہے وہ بھی اپنی خصوصیات کی بنا پر مابعد جدیدیت کی آئیڈیولوجی سے آ کر مل جاتی ہے۔ پہلے تو یہ مغرب کے مقابلے میں مشرقی جڑوں پر زیادہ زور دینا نیز اپنے ادبی اور تہذیبی تشخص کو پہچاننا اور اس کو اپنی تخلیقات میں مختلف رنگ وروپ میں پیش کرنا دوسرے یہ کہ ہندوستانی ادبیات میں بھی کچھ زبانیں ایسی ہیں جو پچھڑی ہوئی زبانوں کو نظر انداز کرتی رہی ہیں۔ جیسے سنسکرت زبان جو ایک لمبے وقت تک اقتدار میں رہی اور ان دبی ہوئی بولیوں کو دباتی رہی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں تک علاقائی ادب کو نظر انداز کیا گیا۔ آج کی ادبی فضا میں دیسی واد کے تحت یہ بحثیں جاری وساری ہیں۔

مابعد جدیدیت میں بہت سی ترجیحات چیلنج بن کر سامنے آئی ہیں۔ مثال کے طور پر عالمیت کے مقابلے میں مقامیت یا ثقافتی تشخص پر زیادہ زور دیا گیا۔ مرکزیت کے مقابلے میں تکثیریت، مہابیانیہ کے مقابلے میں چھوٹے بیانیہ، اشرافیہ کے مقابلے میں دبے کچلے عوام، برہمنی شعریات کے مقابلے میں بھکتی صوفی سنت، دور سے چلی آ رہی عوامی شعریات نے بدلی ہوئی صورت حال میں اپنی شناخت کو منوانا شروع کیا ہے۔ اس سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مابعد جدیدیت نے فکر وخیال اور تجربہ وتجزیہ کے کن زاویوں پر زور دیا ہے۔ یہ موضوعات خواب وخیال یا فکر ونظر کے وہ نقطے ہیں جن کے گرد ہمارے شعراء کا ادبی

شعور اور شعری حسیت اپنے قوس وقزح جیسے دائرے بناتی رہی ہے۔ اب شاعری لفظیات اور شعریات یعنی استعارہ ، تشبیہ، تلمیح اور علامات کی صورت میں جو کچھ تخلیق کیا گیا اور تشکیل عمل میں شریک رہا اسے ہم شعروں ، نظموں اور مصرعوں کی صورت میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس آہنگ اور رنگ سے اپنے اپنے دائرے میں متاثر ہو سکتے ہیں، جسے وہاں شعر، شعریت، نظم، غزل یا آزاد شاعری کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اردو میں بھی مابعد جدید رجحانات داخل ہو چکے ہیں لیکن ان کی رفتار ابھی کچھ سست ہے کیوں اردو والے مزاجاً روایت پرست واقع ہوئے ہیں۔ کسی بھی تبدیلی کو آسانی سے قبول نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذہنی انتشار کا بھی شکار ہیں اور حق تلفی کا بھی۔ اردو کے مقابلے میں ہندوستان کی دوسری زبانیں اپنے اپنے صوبوں میں حکومت کر رہی ہیں لیکن اردو اس اعتبار سے بے در اور بے گھر ہے کہ اس کا اپنا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جہاں اس کا چلن لازمی طور پر موجود ہو اور مقامی حیثیت سے اس کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہو۔ اس لئے بھی مابعد جدیدیت سے اردو کا معاملہ خاص طور پر تعلق رکھتا ہے کیوں کہ دوسری مقامی زبانوں کے مقابلے میں اردو کی حیثیت دوسرے درجے کی ہو کر رہ گئی ہے اور تو اور خود اردو والے اس کو ثانوی درجہ دیے جانے پر قانع ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف نئی پیڑھی کے شاعر اور ادیب یا سیت، بیگانگی، اجنبیت کو بھول کر آگے کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں اور ان کا کہنا یہ ہے کہ نہ ان کا تعلق فارمولائی ترقی پسندی سے ہے اور نہ فیشن پرست جدیدیت سے۔ حالانکہ ان کے ان بیانات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور یہ کہہ کر ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ان کی حیثیت ہی ابھی ادب میں کیا ہے؟ یہ حالات بڑی حد تک حوصلہ شکن اور مایوس کن ہیں۔ اردو کے ادیبوں نے ان کو انگیز کیا ہے اور اپنے لئے مستقبل کی طرف سفر کے امکانات کو تلاش کر رہے ہیں۔ اور زندگی کے نئے مسائل سے اپنا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اب افسانے میں کہانی پن کی واپسی بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور شاعری میں بھی نئے مسائل کی طرف توجہ دی جارہی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نئے ادب اور اس کی شعری خصوصیات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:'' ادب کی پہلی شرط اس کا ادب ہونا ہے اور ادب وہی ہے جو زندگی کی حرکت وحرارت سے جڑا ہو۔ اپنی تہذیبی پہچان رکھتا ہو اور اپنے عہد کے ذہن وشعور، سوز وساز ، درد وداغ، وجستجو وآرزو کی آواز ہو نہ صرف آواز بلکہ موثر آواز ہو اور یہ کہ یہ آواز سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اتر سکے''۔

(ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص615)

پس ساختیات اور مابعد جدیدیت اکثر دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ دونوں میں بہت کم فرق ہے۔ پس ساختیات ایک تھیوری کا نام ہے جب کہ مابعد جدیدیت ایک صورت حال ہے جس کا تعلق معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی ہے۔ اس کے مزاج، مسائل، ذہنی رویے اس کے علاوہ معاشرتی اور ثقافتی فضا جو بحران میں تبدیل ہو چکی ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کی جو فلسفیانہ بنیاد ہے وہ وہی ہے جو پس ساختیات کی ہے۔

مابعد جدیدیت کے زیر اثر لکھنے والے شعراء یہ نہیں چاہتے کہ ان کو کسی خاص نظریہ فکر کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ اب وہ کسی کے محکوم یا غلام ہو کر کچھ تخلیق کرنا چاہتے۔ اس طرح غزل میں ایک نئی فضا پیدا ہو رہی ہے جس میں فکر وفن کے زاویے سے نئے نئے تجربات کیے جا رہے ہیں:

زبان کیوں نہیں بنتی ہے ہم نوا دل کی
یہ کون شخص ہے میں کس کے پیراہن میں ہوں
(عشرت ظفر)

اس فکر وفن کی سطح پر ہمارا نیا ذہن اور سوچنے والا دماغ جن زاویوں سے سوچ رہا ہے اور ایک طرح کے ذہنی پیچ وخم کا شکار ہے۔ To be or not to be کے نازک مرحلے سے گزر رہا ہے۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ بات صرف اشارے کی نہیں شعری اسلوب کی بھی ہے جس کو اس میں نئے انداز کی تلاش کے ذریعے پیشکش کی صورت میں متحرک نظر آتا ہے:

کل تک اپنی شرطوں پر ہی زندہ تھے
اب ہم بھی سمجھوتے کرتے رہتے ہیں
(جاوید قمر)

جاوید قمر کا یہ شعر اس اعتبار سے اور بھی زیادہ خیال انگیز اور معنی آفریں ہے کہ آج کی زندگی میں انسان تنہا ہو کر نہیں جی سکتا۔ اس کی اپنی آئیڈیولوجی اسے ضرور اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو اور اپنی نگاہوں کے سہارے اپنا راستہ الگ تلاش کرے۔ دوسروں کی تقلید آخر کیوں؟ وہ بھی تو اپنی جگہ پر ہے اور ایک ذہنی شخصیت کا مالک ہے مگر حالات ماحول کا تقاضا اور معاشرتی دباؤ اسے اس مسئلے پر دوبارہ غور کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ ذہنی سمجھوتوں پر آمادہ ہوتا ہے۔

یہ ان شعراء کے اشعار ہیں جو ابھی اپنی شخصیت کو منوا رہے ہیں۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ ہر نسل کے بعد انسان کے رویے، اس کے حالات، دلچسپی، ذہنی کیفیت کے مطابق بدل جاتے ہیں۔ ہر نسل کے کچھ اپنے ذاتی فیصلے بھی ہوتے ہیں اور کچھ وہ اپنے سماج، ماحول اور تاریخ کے فیصلوں کو اخذ وقبول کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان فیصلوں میں خود تخلیق نگار کی دلچسپیاں، سوسائٹی کا دباؤ، کہیں تجربے، کہیں ایک خاص قسم کے حالات کے مطابق کچھ فیصلے اور امکانات شامل ہوتے ہیں یہ سب عوامل مل کر اس نسل کو زندگی کی نئی راہیں ہموار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن یہ نسل کسی کے حکم کو ماننے سے یکسر انکار کرتی ہے۔ اس میں تجسس کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے اس کے ساتھ اس کو اپنے اعتماد کو بحال کرنا ہوتا ہے نیز اپنی دنیا، اپنی ذہنی سوچ کے مطابق تشکیل کرنی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون 'مابعد جدیدیت کے حوالے سے کشادہ ذہنوں اور نوجوانوں سے کچھ باتیں' میں فن کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''مابعد جدیدیت فن کے میکانکی تصور کی نفی کرتی ہے کہ فن ہرگز یہ نہیں کہتا کہ زندگی سے منہ موڑا جائے۔ زندگی سے منہ موڑ کر تو فن بھی فن نہیں رہتا۔ ادبی قدر کا مجرد تصور ہی غلط ہے کیوں کہ سچی ادبی قدر زندگی کے معنی کی حامل

ہوتی ہے اور سماجی احساس اور ثقافتی سروکار
سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ غالب نے کہا تھا''
شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے''۔
(جدیدیت کے بعد،ص:31)

ادب،تہذیب وثقافت،تاریخ وروایت سے اگر الگ بھی ہونا چاہئے تو نہیں ہوسکتا اس لئے کہ ادب بھی فنون لطیفہ کا ہی ایک حصہ ہے اور شاعری تو خاص طور پر فنون لطیفہ میں ادب بھی داخل ہے۔فنونِ لطیفہ ہماری تہذیب، تاریخ اور روایت سے جس طرح جڑے رہتے ہیں اسی طرح ادب بھی وابستہ ہے بلکہ عوام سے گہرا رشتہ ہونے کے باعث اس میں تحرک اور تسلسل کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں۔اس کو ساختیات سے بھی جوڑا گیا اور مابعد جدیدیت کے ساتھ پس ساختیات سے بھی ساختیات دراصل زبان کو صرف و نحو کے لحاظ سے جوڑ کر دیکھنے اوران میں فنی تاثرات،آواز، نغمے اور خاموشی یا سکون اور سکوت کے لحاظ سے پیدا ہویے ہیں۔ان کو شامل کرتے ہوئےشعر وادب اور ادبی تحریروں کا مطالعہ ہے جب لفظ معنی اور ادبی رشتہ اہمیت اختیار کر جائیں گے تو ساختیات اور پس ساختیات کے مسائل بھی ابھر آئیں گے۔مثلاً لفظ کا آوازوں سے کیا رشتہ ہے؟ آوازوں کا سماعت سے اور موسیقی کی طرح روح اور راحت سے کیا تعلق ہے یعنی آوازیں سکون بخشتی ہیں، جوش پیدا کرتی ہیں، جذبے کو ابھارتی ہیں اور مختلف جذبات میں ایک ربط پیدا کرتی ہیں،اسی لیے شاعری خوبصورت گفتگو،شعر وغزل اور نغمہ و آہنگ کا اثر ہمارے ذہنوں اور ہماری روح کو متاثر کرتا ہے۔ان مسائل پرغور کرنا اوران کا سماجیات،تاریخیات اور حسیات سے رشتہ جوڑنا ہماری فکری اور فنی تحریکات میں شامل ہوتا رہے گا اور اس پر گفتگو ہوتی رہے گی۔ ہمارے یہاں فصاحت کی بحثیں دراصل انھیں بحثوں کا حصہ ہیں اور بلاغت دراصل خصوصیات سے آگے بڑھ کر اظہاریت سے رشتہ رکھتی ہیں کہ کیا بات کہی جائے، کن الفاظ میں کہی جائے کس لب ولہجہ کے ساتھ کہی جائے تا کہ جو اثرات نگاہ میں ہوں اور جن سے گفتگو کا مقصد وابستہ ہو ان تک رسائی میں کوئی دشواری نہ ہو۔

مابعد جدیدیت کے تحت چھوٹی چھوٹی ذاتوں کی طرف بھی توجہ دی جارہی ہے اب دلت لٹریچر پر باقاعدہ اردو زبان میں ہی نہیں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی لکھا جارہا ہے۔ان کے مسائل بھی ہمارے لئے اس لائق ہیں بلکہ ہماری ایک سماجی ضرورت اور معاشرتی تقاضے کا درجہ رکھتے ہیں۔یہ نئی تبدیلی ہے جو ہمارے زمانے کے ادب اور معاشرتی رویوں میں آئی ہے۔اس میں ایک فرق ضرور ہے کہ ہر طبقے کا کلچر اب ہمیں اپنے ہی کلچر کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے خاص طور پر قبائلی کلچر یا دیہاتوں کا چکر ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے اور ہم اسے اپنی تحریروں میں بھی پیش کرتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب وتمدن، رسم کے رواج کے بارے میں ہمارے تعصّبات اب کم ہوگئے ہیں۔ اوراس طرح سماج جیسے پہلے طبقوں میں بٹا ہوا تھا اب اسی طرح اور اس سطح پر تقسیم نہیں ہے۔اس کے ساتھ ملکوں،قوموں اور ملتوں کے درمیان نسلی تقسیم بھی کم ہوئی ہے مگر باقی ہے۔اس کی مزید وضاحت اس طور پر بھی کی جاسکتی ہے کہ آمریت ، حاکمیت، برتری، اور بالادستی کا تصور ختم ہورہا ہے اور جہاں ختم نہیں ہوا وہاں کم ہوا ہے۔ کچھ باتیں ہمارے زمانے کے فکری مسائل کا حصہ ہیں ان میں مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کا اتفاق اور اختلاف بھی ہے۔

مابعد جدیدیت کے رویوں میں ایک نمایاں اور قابل شناخت رویہ یہ بھی ہے کہ مابعد جدیدیت نے استعارہ۔تشبیہ اور علامتوں سے انحراف نہیں کیا بلکہ اس رویہ سے انحراف کیا کہ ہر بات کو علامت مان لیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم علامتوں کے مقابلے میں جدید علامتوں کی ہر دور میں ضرورت پیش آتی رہے گی لیکن ایک علامت کو رد کرتے ہوئے اور دوسری علامت کو قبول

کرتے ہوئے تناسب، توازن اور ذہنی ہم رشتگی کا پہلو ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے۔

تنقید ادب کی تابع ہوتی ہے، ادب میں کچھ سامنے آتا ہے وہ شخصی اور غیر شخصی دونوں اعتبارات سے سماجی افکار اور ذاتی تجربوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ تنقید اس سے راہ فکر و عمل اختیار کرتی ہے اور اپنے فیصلوں کو ان بنیادوں پر استوار کرتی ہے جو خود ادب میں فکری رسائیوں اور نارسائیوں کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے مابعد جدید تنقید پر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

''جہاں تک مابعد جدید تنقید کا سوال ہے تو اس کی باضابطہ تشکیل نہ ہونے کے باوجود اس کے نظری مباحث انھیں بنیادوں پر استوار ہوں گے جو مابعد جدید تصور ادب کے نظری مباحث ہیں''۔ (دور مابعد جدیدیت پر مکالمہ، ص 341)

مابعد جدیدیت پر جو تنقید ہو رہی ہے اس کا بڑا حصہ تو اس دور کا ادب ہی ہوگا اس لئے کہ اس کے حوالے کے بغیر وہ پھر ایک عام تنقید ہو جائے گی اور اس کی روشنی میں مابعد جدیدیت کو سمجھنا قدرے مشکل ہوگا۔

مابعد جدیدیت دور میں ادبی منظر نامے پر بعض دور رس تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ رفتہ رفتہ سارا علمیاتی زمرہ تبدیل ہوگیا ہے۔ نئے مباحث کے سامنے آنے سے انسان، ادب، آرٹ، معنی اور آئیڈیولوجی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور نئے فکر انگیز سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ ادب سماجی حالات، تہذیب اور زبان سے بنتا ہے۔ زبان کے سوچنے کے رویوں میں تبدیلی کا اثر ادبی تخلیق اور ادبی تنقید پر پڑتا ہے۔ زبان تہذیب کی زائیدہ ہے یہ خود مختار یا خود کفیل نہیں ہے۔ زبان تہذیبی اور ثقافتی رویوں سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ سب کچھ وقت کے محور پر یعنی تاریخ کے اندر رونما ہوتا ہے۔ اسی طرح مصنف کی موضوعیت، یعنی اس کا ذہنی تخلیقی عمل بھی تاریخ اور تہذیب سے تشکیل پاتا ہے۔ ثقافت یا متن سے باہر کچھ نہیں۔ مصنف کا رومانی تصور کہ وہ خود مختار اور خود کفیل طور پر تخلیق کرتا ہے اب اس پر سوال قائم ہو چکا ہے۔

متن کی خوش آہنگی اور خوش رنگی سے صاحب متن کا بھی ایک تحقیقی اور تہذیبی رشتہ ہوتا ہے لیکن جب وہ متن مطالعہ یا مسالمہ کی صورت میں دوسروں تک پہنچتا ہے تو اس کا اثر و تاثر تصور اور تصویر بہت کچھ بدل جاتے ہیں۔ اس میں توسیع بھی ہو سکتی ہے اور سمٹاؤ بھی آسکتا ہے اور نئی پہلو داریاں بھی ابھرتی ہیں۔ متن کے اس حصے کو یا اس پہلوداری اور پرکشش عناصر کو مابعد جدیدیت میں زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے جسے Inter Textuality (بین المتونیت) کہا جاتا ہے۔ متن کے سلسلے میں یہ مباحث بنیادی طور پر جدیدیت اور ترقی پسندی کے دور میں کم و بیش موجود تھے مگر اس وقت متن سے زیادہ اس تصور اور ذہنی تصویر پر زور دیا جاتا تھا جو نظریات سے زیادہ تعلق رکھتی تھی۔ متن اپنی بنیادی حقیقت کے ساتھ زیر بحث نہیں آتا۔ ہم قدیم کلاسیکی ادب میں بھی متن سے متعلق بعض مباحث کو اہمیت دیتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق زبان، بیان، معنی اور تلفظ سے تھا مگر وہ اسے ایک قواعد کی صورت میں لیتے تھے، علم معنی و بیان کے قاعدوں میں قید رکھتے تھے متن کی انفرادیت اور اساسی نوعیت کو وہ ثانوی درجے پر رکھ کر بات کرتے تھے۔ مابعد جدیدیت کی تنقیدی نظریے نے اس کو زیادہ اہم قرار دیا۔ بین المتونیت کا حوالہ مابعد جدید تنقید میں زیادہ ملتا ہے۔ یہ بھی ایک نئی اصطلاح ضرور ہے مگر نیا تصور نہیں۔ اور اس کے مفہوم میں وہ باتیں شامل رہیں جو آج کی تنقید میں بطور خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ بطور خاص اس لئے کہ یہ ذہنی امور پہلے بھی ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ حالی نے اس کی طرف مقدمہ شعر و شاعری میں واضح اشارے کیے ہیں۔ مابعد جدیدیت میں ان مباحث کی اہمیت زیادہ ہوگئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پہلو پر توجہ کم ہوئی ہے جو پہلے زیادہ اہم تھا۔ یعنی نظریہ خیال، استعارہ اور تشبیہوں کی جدت، مابعد جدیدیت نے اس پہلو کو خاص طور پر اہم قرار دیا اور تنقیدی روش و کشش میں شامل کیا۔

متن اظہار کے طریقے کے بعد بنتا ہے۔ محض خیال، نظریہ، قصے، کہانی اور پس منظر کو متن نہیں کہا جاسکتا۔ متن ماخوذ بھی ہوتا ہے اور اضافی بھی، خلاصہ متن کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے اور تشریح متن کی صورت میں بھی۔ یہ رشتے دوسرے ہیں اور ان کو صاحب متن مطالعے، مشاہدے اور ذہنی پس منظر کے طور پر زیر بحث لاتا ہے لیکن خود خیال، نظریہ اور فکر وفن کا تصور متن نہیں کہلاتا۔ وہ متن کا سرچشمہ ہوسکتا ہے، مشاہدے کا نظری پہلو ہوسکتا ہے، متن تو اس وقت بنے گا جب وہ خود ایک لفظی پیرایۂ اظہار کی شکل اختیار کرے گا۔ ہمارے متن حال وخیال، افکار ونظریات، قصے اور کہانی موضوع اور مواد کے لحاظ سے مختلف نوعیت رکھتے ہیں مگر یہ نوعیت ایک سے زیادہ نوعیتیں متن کے ذہنی اور فکری ماخذ کے طور پر پیش نظر رکھی جاسکتی ہیں۔ جب لفظی ساخت کے اعتبار سے کوئی متن ایک خاص شکل اختیار کرے تو وہ متن کے ذیل میں آتا ہے اور اس سے پیشتر اس کی حیثیت ایک ناتراشیدہ اظہار کی ہوتی ہے جس کی ہیئتی حدیں واضح نہیں ہوتیں۔ متن پر گفتگو مختصراً حوالے کے طور پر بھی آسکتی ہے، تشریح الفاظ کے اعتبار سے بھی، تفسیر کے اعتبار سے بھی اور اس پر تنقید، تحسین اور تنقیص کے زاویہ نگاہ سے بھی۔ بقول پروفیسر ابوالکلام قاسمی:

> ''مابعد جدید ادب کا ایک امتیازی پہلو، ادب کے آفاقی قدروں اور آفاقی اصولوں کے بجائے مقامی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی بازیافت بھی ہے''۔

(ابوالکلام قاسمی، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، ص344)

اصل میں مقامی طور پر ثقافتی بازیافت بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو ہماری تنقید اور تخلیق میں کلی اعتبار سے کوئی نیا اضافہ ہو۔ ہم اپنے ادب کو خلا میں جنم نہیں دے رہے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حوالے میں کسی خاص شہر، کسی خاص سرزمین کا ذکر ہم روایتی حوالوں کی صورت میں نہ کرکے کسی متعین صورت حال کی طرف اشارہ کریں جو نئی روش ہے، اس نے ادب کے مقامیت اور علاقائیت کو واضح اشاروں کے ساتھ اپنے قاری کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ یہ اس سے پہلے بھی ہوتا رہا۔ مثال کے طور پر ہم دکنی ادب میں جب شہروں، بازاروں، خانقاہوں اور درباروں کا ذکر پڑھتے ہیں تو یہ سوچے بغیر نہیں رہتے کہ شاعر یا قصہ نگار کے سامنے اس کے عہد کا فلاں دربار، فلاں خانقاہ، فلاں مدرسہ رہا ہوگا۔ اس میں اس نے تخلیقی اور تمثیلی طور پر کچھ اضافے کردیے ہوں یہ بالکل ممکن ہے لیکن اس بیان اور شہری صورت حال کے اس ذکر میں کوئی نہ کوئی شہر، شہری بستی یا آبادی شریک ہوتی ہے مثلاً دہلی کے کسی ادب پارے میں اگر تباہی و بربادی کا ذکر آیا ہے تو وہ لازماً عہد محمد شاہی کے بعد کی دلی ہے اور اگر شاہی شان وشکوہ اور شہری رونقوں کا ذکر ہے تو وہ یقیناً لکھنؤ کے آصف الدولہ کا دور ہے یا پھر دہلی میں ان کا تعلق عہد محمد شاہی سے پہلے دہلی کا ہے۔ عہد محمد شاہی میں بھی تباہی اور بربادی آئی لیکن شہر میں کوئی بہت بڑا فرق شہری رسوم ورواج، چہل پہل اور رنگ وآہنگ کے اعتبار سے نہیں پڑا۔ مثنوی سحر البیان، گلزار نسیم اور بعض دوسری مثنویوں میں جس شہر کو پیش کیا گیا ہے وہ دہلی اور لکھنؤ کی شہری آبادیوں کے نقشے ہیں۔ بعد کے ادب میں جو کردار سامنے آئے ہیں وہ عہد سرسید کی دلی ہے اور مرثیوں یا تحریروں میں جن بربادیوں کا ذکر آیا ہے وہ دلی کے انقلاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمارے یہاں تنقید نگاروں نے تاریخ کا رشتہ تنقید سے نہیں جوڑا اور اسی لئے بات کو to the pointانداز سے نہیں کہا گیا کہ اس کا تاریخ، تہذیب، ادبی

روایت سے ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہوجائے ۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''کسی ادب کو پڑھنے کے لئے آفاقی تنقیدی اصولوں سے زیادہ ضروری اس بات کا جاننا ہے کہ جس تہذیب نے وہ ادب پیدا کیا ہے اس میں کس چیز کوادب کہتے ہیں کیونکہ آخری تجزیے میں بس یہی بات نکلتی ہے کہ جن متون کوادبی معاشرہ ادب کہے وہ ادب ہے جن کو ادبی معاشرہ اچھاادب کہے وہ اچھاادب ہے، اور جن کو ادبی معاشرہ بڑا ادب کہے وہ بڑا ادب ہے''۔

(شمس الرحمٰن فاروقی،شعرشورانگیز،ص:03)

یہاں آفاقی تنقیدی اصولوں کا تصور ایک خاص مفہوم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔نہیں تو ادب ہمیشہ دو یا تین باتوں یا بنیادوں پرمشتمل ہے۔ پہلے تاریخ ، دوسرے تہذیب اور تیسرے تعلیم جس کے دائرے میں تربیت بھی آتی ہے۔ تاریخ صرف بادشاہوں ، امیروں یا ان کے تخت نشینی کے ادوار کا نام نہیں ہے بلکہ بحیثیت مجموعی کوئی معاشرہ جن واقعات اور حادثات سے گزرا ہے وہ اس تاریخ کا حصہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس بات سے وہ معاشرہ زیادہ متاثر ہوا۔ اس لئے کہ تاریخ صرف وقت کے گزرنے کا نام نہیں ہے ہمارے مورخوں نے بھی اس طرف کم توجہ دی،شاعراور ادیبوں سے ہم زیادہ توقع رکھ سکتے ہیں۔ وہ زیادہ تر تاریخ کے ایک روایتی تصور کو ہی دہراتے رہے۔ میر ہوں یا سوداء انشاء ہو یا مصحفی اگر اپنے زمانے کے رویے سے متاثر نہ ہوتے تو ان کا بحیثیت مجموعی یہ سفر دوسرے انداز سے گزرتا اور ان کے رنگ وسخن کو ہم ممکن ہے کہ دوسرے انداز میں ڈھلا ہوا دیکھتے۔

ادبیت کا بنیادی تصور اور اس سے متعلق تاثرات ایک مجموعی کردار بھی رکھتے ہیں۔اسی کو کسوٹی بنایا جائے تو بہتر ہے۔اب اس کے بعد کون سا ادب بڑا ہے،کون سا آگے بڑھنے والا ہے،کون سا قدامت سے رشتہ رکھتا ہے، ان جیسے امور کا فیصلہ بے شک کیا جائے لیکن ادبیت کے تحت ہی کیا جائے ،نظریہ اور خیال کے تحت نہیں ۔نظریات اپنی جگہ پر ہوتے ہیں۔ وہ ادبی معاشرتی، تاریخی اور تہذیبی فضا سے جنم لیتے ہیں اور قابل احترام ہوتے ہیں لیکن ادب کو ان کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ سب معاون نظریات ہیں،ان سے الگ ہٹ کر ادب اپنے تصورات اور تاثرات کے اعتبار سے کیا ہے یہ دیکھنا ہوگا اور اس میں ادبی قدریں کس طرح کام کررہی ہیں۔ادب کے ساتھ دو تین اہم امور وابستہ ہوتے ہیں۔علاقائیت اور مقامیت سے اس کا لسانی رشتہ اور ادبی تعلق اس کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے لیکن اس کی وجہ سے ادبی قدروں کو پامال نہیں کیا جاسکتا۔ علاقائی حوالے اگر ادب کی اپنی روش وکشش میں معاون ہوتے ہوں تو ان کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے۔ دوسرا رشتہ ادب کا اپنے زمانے سے ہوتا ہے جو ایک فطری تقاضا ہے لیکن آج کے زمانے سے ادب کا رشتہ آج کی تہذیبی قدروں کا رشتہ ہے،ادب کی تاریخ میں ماضی اور حال بھی شامل ہوتے ہیں اور قدیم ادب کی تحسین اور تنقید کی منزل سے گزارتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مابعد جدیدیت کا ادب بعض نئے رجحانات کو اپنائے ہوئے ہے۔ان میں تین باتیں خصوصیت سے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس نے قدیم زمانے کے دیو مالائی تصورات سے کچھ علامتیں اخذ کی ہیں اور ان پر اضافہ بھی کیا۔ یہ جدیدیت میں خاص طور پر ہوا تھا۔اب اس کی سکہ بند پیروی تو نہیں کی جارہی مگر اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ افریقہ میں سیاہ فام شاعری کا فروغ پانا ہندوستان میں دلت ساہتیہ،ایک طرح کا ذہنی عمل تو ہوسکتا ہے لیکن اس سلسلے میں نامناسب بات یہ ہے کہ اس کی پیش کش کے

وقت ادبی قدروں کونظر انداز کردیا جائے پھر وہ ایک طرح کی دعویداری، پروپیگنڈا، جارحیت یا پناہ گزینی تو ہوسکتی ہے اورنفسیاتی مطالعہ میں کام دے سکتی ہے لیکن ادبیت سے اس کا رشتہ یا تو کمزور ہوجائے گا یا پھر ٹوٹ جائے گا۔نسائی ادبی رویے ہمارے ادب کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے لوک گیت وہ عورتوں کے لکھے ہوں یا مردوں کے، ہمارے بھجن جس میں بات ایک عورت کی طرف سے کی جاتی اور کہی جاتی ہے اس میں نسائیت بہرحال موجود ہے۔عورت کے جذبات، احساسات یہاں تک کہ اس کی مشکلات اس کا پریم اور اس کی دوریاں یہ سب شامل ہیں۔ بات اس نسائی ادب کی ہے جو آج کچھ خاص رجحانات تقاضوں اور اجتماعی رویوں کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔ وہ بھی کہیں احتجاج ہے، کہیں اپنی بات پر زور ہے اور کہیں نئے تقاضوں کی نمائندگی ہے اور اس معنی میں صحیح ہے۔اس کو کسی خاص زاویے سے وابستہ کرکے یا دائرے میں قید کرکے دیکھنا بعض اعتبارات سے غلط ہوگا، اس میں ادب کہاں تک آیا ہے۔جذبہ واحساس کی ترجمانی کس طور پر کی گئی ہے اور اس کی سماجی حیثیت کے علاوہ ادبی قدرو قیمت کیا ہے۔ یہ بھی دیکھنا ہے۔ہم اس ادب کو جو تانیثیت کے اظہار میں معاون ہوا ہے اور جس نے دائرہ بند فکر کو اپنے طور پر اہمیت دی ہے وہ اس لحاظ سے تو بہتر ہے کہ نئے زاویہ ہائے نگاہ اس شکست وریخت سے ابھریں گے لیکن اسے ایک جامد حقیقت مان کر گفتگو نہ کی جانی چاہئے۔ تہذیبی، لسانی اور ادبی رشتے، اپنی اپنی جگہ پر کام کرتے رہیں اور ادب پارے کو ایک خوبصورت شکل دینے میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں یہ زیادہ صحیح بات ہوگی۔

متن کا مطالعہ زبان کے رشتے سے بھی ہوسکتا ہے لفظوں کے رشتے سے بھی، بیان کے رشتے سے بھی اور موضوع فکر وخیال کے رشتے سے بھی، کوئی بھی ادب پارہ اچھا ہو یا برا اگر اس کا مطالعہ صرف زبان کے رشتے سے کیا جارہا ہے تو پھر وہ اچھی تنقید نہیں ہے اس لئے کہ ہم تو اس کی لفظیات سے گفتگو کررہے ہیں۔اس میں روانی وسلاست، سادگی، حسن اور رنگینی کتنی ہے یہ اس ادب پارے کی ادبی اور لسانی اہمیت کی طرف لے آنے والی بات ہے اور اس کا تعلق تہذیب اور تاریخ سے کیا بنتا ہے۔ یہ ایک تیسرا زاویہ ہے اور ادبی اعتبار سے اس کی قدرو قیمت کیا ہے یہ ایک چوتھا زاویہ ہے۔سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہم ادب پارے کا مطالعہ موضوع کے لحاظ سے کررہے ہیں۔لسانیات کے اعتبار سے کررہے ہیں یا پھر سماجیات کے اعتبار سے اور ان تینوں سے ہٹ کر ہم اس میں ادبیت اور شعریت کو تلاش کررہے ہیں یا پھر سماجیات کے اعتبار سے اور ان تینوں سے ہٹ کر ہم اس میں ادبیت اور شعریت کو تلاش کررہے ہیں تو بات پھر الگ ہوجائے گی۔ ہماری تنقید کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ ہم سماجیات پر زور دے رہے ہیں۔ سیاسیات پر زور دے رہے ہیں، لسانیات یا ہیئتی ساخت پر زور دے رہے ہیں یہ سب اپنی اپنی جگہ پر قابل توجہ ہیں لیکن توجہ بنیادی طور پر جس بات پر مبذول ہونی چاہئے وہ ادبیت ہے۔موضوعیت تو سماجی مطالعہ ہے، تہذیبی مطالعہ ہے، طبقاتی انداز نظر کا مطالعہ ہے، یہ سب مطالعیمفید مطلب ہیں لیکن ان کے ذریعے ادب نہیں سامنے آتا۔ادب کی سماجیات سامنے آتی ہے یا لسانیات سامنے آتی ہے اور زیادہ تر تنقیدیں غیر ادبی مباحث پر مشتمل ہیں یعنی ادب کے فکری یا فنی پس منظر میں گفتگو کرتی ہیں۔ خود ادب کی اپنی نظریاتی اور ادبیاتی قدروں سے گفتگو نہیں کرتیں۔

سلسلہ جاری

رعائتی نرخ پر

ادیبوں وشاعروں کی کتابوں کے اشتہارات

''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

مضمون

شاھد نوخیز اعظمی

مولانا آزاد کی شعری بصیرت ''غبار خاطر'' کے آئینہ میں

غبار خاطر مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہے جسکا پہلا خط ۳ اگست ۱۹۴۲ء کو اس وقت لکھا گیا جب مولانا ایک جلسے میں شرکت کے لئے بمبئی جارہے تھے اس وقت مولانا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر بھی تھے مولانا نے یہ خط ٹرین میں لکھا تھا اسی جلسہ میں ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو ہندوستان چھوڑو تحریک شروع کرنے کی تجویز منظور ہوئی تھی اس نعرے سے بوکھلائی فرنگی حکومت نے ۱۹ اگست سے ہی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں جسمیں مولانا آزاد بھی گرفتار ہوئے انہیں احمد نگر کے قلعہ میں رکھا گیا اسی قلعہ سے انہوں نے اپنے رفیق مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء سے لکھنا شروع کیا اور آخری خط ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کو لکھا۔

مولانا آزاد کی شخصیت تحریکی اور تحریری تھی وہ ہمیشہ بر سر کار یا برسر پیکار رہے زندگی کا ایک بھی لمحہ انہوں نے غفلت فراموشی یا خودگریزی میں نہیں گزارا جب قید میں ان کی تحریری اور تحریکی زندگی بھی قید کرنے کی کوشش کی گئی، کتابوں اور مطالعہ سے بھی روک دیا گیا، جسکی وجہ سے وہ کسی مستقل موضوع پر کچھ نہ لکھ سکتے تھے تو انہوں نے ایسے حالات میں دل کا غبار نکالنے کے لئے مکتوب نما انشائیہ لکھنا شروع کیا جسکے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ:

''یہ مکاتیب کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں گے لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خان صاحب کو انکا علم ہوا تو مصر ہوئے کہ انہیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے چونکہ ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے اس لئے ان مکاتیب کی اشاعت کا سروسامان کر رہا ہوں جس حالت میں قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے اسی حالت میں طباعت کے لئے دے دئے گئے ہیں نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔''

مولانا آزاد میں انشاء پردازی کی جو اعلیٰ صلاحیتیں موجود تھیں اس کا استعمال انھوں نے غبار خاطر میں بھرپور انداز میں کیا ہے اشعار سے پر مولانا کی یہ تحریر گلستان سعدی کی یاد دلاتی ہے جہاں شعر نثر میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں، بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شعر اسی عبارت کے لئے نازل ہوئے ہیں۔اجمل خان نے مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ غبار خاطر کو مرتب کر کے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا ۱۹۶۷ء اور ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۹ء، ۲۰۰۱ء، ۲۰۰۵ء، اور ۲۰۰۶ء میں مالک رام نے بڑی محنت لگن اور دیدہ ریزی کے ساتھ اسکو متعدد بار مرتب کر کے شائع کیا اسکے علاوہ بھی مختلف شخصیات نے اس کے ایڈیشن شائع کئے پاکستان میں بھی اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔غبار خاطر میں مولانا کی شعری بصیرت اپنے نکتۂ عروج پر ہے بیشتر عظیم شعراء کے اشعار اور مصرعوں کو انہوں نے اپنی نثر میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر اسی نثر کے لئے کہے گئے تھے انکے بیشتر خطوط میں اشعار کثرت سے پائے جاتے ہیں جس طرح شیخ سعدی نے گلستان میں اشعار سے پیوندکاری کا کام لیا ہے اسی طرح مولانا آزاد نے اپنی نثر کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے فارسی اشعار کا بھرپور استعمال کیا ہے بالعموم انکی تمام تصانیف میں یہ اشعار پائے جاتے ہیں بالخصوص غبار خاطر میں انکی رعنائی و برنائی دلکشی و دلکشائی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔

مولانا آزاد نے غبار خاطر کے صفحات پر مناظر فطرت سے دلچسپی پھولوں پھلوں اور پرندوں کا جو حسین ذکر کیا ہے اس کے بارے میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اپنی تصنیف مولانا آزاد فکر و فن کے صفحہ ۳۷۸ پر اس طرح کرتے ہیں:

''غبار خاطر کے صفحات میں ابوالکلام آزاد نے فطرت کے مظاہر و مناظر سے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور پھولوں پھلوں

پرندوں بیل بوٹوں کی جو رنگین دنیا اس کتاب کے صفحات میں نقش پذیر ہوئی ہے ان سب سے ان کے رومانی مزاج ،فطرت دوستی ، قوت مشاہدہ اور جمال نظر کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ معمولی واقعات میں بھی بڑے بڑے مضمرات کا پتہ پا لیتے ہیں رنگ و بو کا لطیف احساس اور مشاہدہ کی وسعت جسکا اظہار غبار خاطر کے صفحات پر ہوا ہے وہ مولانا کے ادب کا ایک مخصوص پہلو ہے اس مطالعہ اور مشاہدے کے اندر مولانا نے خود اپنے فلسفہ زندگی اور عرفان حیات کے متعلق اپنی فکر و نظر کے متحرک نقوش کچھ اسطرح پیش کر دئے ہیں کہ ان کے ادب کے نفسیاتی پس منظر کا ایک گوشہ ظاہر ہوتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کس انداز سے اور کس رخ پر زیادہ سوچتے ہیں۔''

مولانا آزاد نے بارہا فرمایا کہ فطرت کی بخشائش جمال نے جس طرح صبح کی صورت کو حسن و زیبائی بخشی اسی طرح اسکی معنویت کو بھی جمالِ معنوی سے آراستہ کیا ہے اعتدال ہی معنویت کا جمال ہے اسی طرح وہ باغوں راغوں اور گلزاروں کا تذکرہ بھی مصورانہ چابک دستی اور شاعرانہ بصیرت سے کرتے ہیں یہ پر بہارا ورگلزار انداز بیان دیکھئے۔

''کوئی پھول یاقوت کا کٹورہ تھا،کوئی نیلم کی پیالی تھی کسی پر گنگا جمنی قلم کاری کی گئی تھی کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اسطرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا کہ صناع قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا صاف کرنے کے لئے جھٹکنا پڑا اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں بہار صبح کی بیلیں برآمدے کی چھت تک پہنچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں چند دنوں کے بعد نظر اٹھائی تو ساری چھت پر پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں لوگ پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور کروٹوں سے اسے پامال کرتے رہتے ہیں ہمارے حصے میں کانٹے کا فرش آیا تو ہم نے پھولوں کی سیج بستر سے اٹھا کر چھت پر الٹ دی تلووٴں کے کانٹے چنتے رہتے ہیں مگر نگاہ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتی ہے۔''(بحوالہءغبار خاطر صفحہ ۲۱۴)

رنگ کی نظر افروزیوں بو کی عطر بیزیوں نغمہ کی جان نوازیوں سبزہ وگل کی رعنائیوں قمری و بلبل کی نغمہ سنجیوں کی رنگینیاں جو فطرت دوستی حقیقت پسندی اور جمال آفرینی کا درس دے رہی ہیں وہ صرف لطف اندوزی اور عیش پرستی نہیں ہے بلکہ یہ ایک درس عبرت و عافیت بھی ہے یہ واقعات مضمرات کا پتہ بھی دیتے ہیں اور فانی دنیا کی بے ثباتی کا درس بھی دے رہی ہیں دیکھئے کہ موسمی پھولوں کی بوقلمونیوں کا تذکرہ کیسے کرتے ہیں:

''ان پھولوں کو موسمی کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی پیدائش اور زندگی صرف موسم ہی تک محدود رہتی ہے اور ادھر موسم ختم ہوا ادھر انہوں بھی دنیا کو خیر آباد کہہ دیا زندگی کا ایک ہی پیرہن ان کے حصہ میں آیا تھا وہی کفن کا کام بھی دے گیا۔۔۔۔۔بہار میں پھولوں سے درخت لد جاتے ہیں خزاں میں غائب ہو جاتے ہیں پھر بھی جونہی موسم کا دور پلٹتا ہے دوبارہ آ موجود ہو جاتے ہیں مگر موسمی پھولوں کے پودوں کا شیوہ یک رنگی و یک ساختی دیکھئے کہ جب ایک مرتبہ دنیا کو پیٹھ دکھا دی تو پھر دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتے۔''(غبار خاطر صفحہ ۲۱۸)

پھولوں کی زبانی ہی انہوں نے نفسیاتی پس منظر کے کئی گوشوں کو روشن کیا ہے پھولوں رنگوں اور موسموں کا جس وسیع پیمانے اور حسین پیرائے میں انہوں نے استعمال کیا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی ہے غبار خاطر کے صفحہ ۲۱۸ کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے:

''کلوری،اوسا،سویریا کی شاخیں کلیوں سے لدی ہوئی ہیں ان کا پھول پہلے پنجے کی طرح کھلیگا پھر پیالے کا طرح الٹ جائیگا پھر فانوس کی طرح مدور ہونے لگیگا اور پھر دیکھئے کہ جن منزلوں سے گزرتا ہوا آیا تھا انہیں منزلوں سے گزرتے ہوئے واپس لوٹنے لگیگا واپسی مُن پہلے فانوس کی اٹھی ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیالہ بنائیں گی پھر اچانک یہ پیالہ الٹ جائیگا گویا زندگی کے جام واژگوں میں اب کچھ باقی نہ رہا'' لیجئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی'' ہر پھول کی آمد و رفت کہ یہ مسافت دس بارہ دن

کے اندر طئے ہوا کرتی ہے چھ دن آنے میں لگتے ہیں چھ دن واپسی میں اور دراصل اس کا آنا بھی جانے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ تیرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی۔''

مولانا آزاد نے مناظر فطرت کی جو تصاویر اپنی تحریروں میں پیش کی ہے وہ ان کا تجربہ مشاہدہ اور تجزیہ ہے جو حقیقت پر مبنی ہے جہاں باریک ہستی بصیرت اور بصارت کا عمل دخل ہے جسمیں شاعر، مفتی، مصور اور فلسفی کی روح یکجا ہوگئی ہے جسکی تلاش حسن و جمال ہے وہ بجھے ہوئے چہرے سے کوئی بھی امید نہیں رکھتے کیونکہ زہد خشک اور طبع خشک کی گرم بازاری کو نظامِ فطرت کے خلاف سمجھتے ہیں جسکے بارے میں واضح طور پر غبار خاطر کے صفحہ ۱۰۰ پر لکھتے ہیں کہ:

''ایک فلسفی ایک زاہد ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے جو نقاش فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ماتم، اور پھولوں کی رنگین کی ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں اسمیں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے مستحق نہیں ہو سکتے فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔''

اسلوب جلیل کا یہی انداز اور فارسی انداز بیان کی گونج غبار خاطر کے اوراق پر بھی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر غبار خاطر کے صفحہ ٦٩ کی یہ عبارت پیش خدمت ہے:۔

''جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرندہر صبح وشام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟''

الفاظ کے زیر و بم فقرات کی ترتیب، لہجے کے صوتی آھنگ اور فریب تخیل نے عبارت کو اس قدر خوش آھنگ بنا دیا کہ وزن و بحر کا التزام نہ ہوتے ہوئے بھی شعر کا لطف پیدا ہو جارہا ہے اس صوتی آھنگ اور فطری رنگ سے آراستہ غبار خاطر صفحہ ٦٧ کی یہ عبارت پیش کی جاسکتی ہے جہاں شعر پر نثر کی حکمرانی ہے خود دیکھئے۔

''جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آب رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی جلوہ ترازیاں رکھتی ہوں اسمیں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزم نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو، اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی کھل کر اپنی جگہ نکال لے سکتی ہو۔''

آزاد کا یہی جلیل اسلوب تھا جسکو دیکھکر نظم حسرت نے بھی حسرت کی۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

آزاد کی نثر نگاری میں بہت سے ایسے شعری وسائل کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے جو حقیقتیں شعری نسب سے ہیں لیکن نثر میں اس خوبی سے ان کا استعمال ہوا کہ نثر شعر سے زیادہ جاذب اور پراثر ہوگئی تشبیہ، استعارہ، کنایہ، ضعف تجسیم اور مبالغہ اگر چہ یہ شعری سنگار ہیں لیکن نثر میں ان کا بھر پور استعمال موصوف نے ہی کیا یہ خوبی ان کی تمام تحریروں و تصنیفوں میں کم و بیش یکساں ہے۔ قدرت نے ان کے مزاج میں جو شعریت ودیعت کی تھی وہ ان کی نثر میں در آئی ہے غبار خاطر کی یہ تحریر دیکھئے۔

’’ کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی۔ سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کرناچ رہا تھا۔نسیم صبح کے جھونکے احاطے کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے، کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلتا رہے۔‘‘

مالک رام نے ساہتیہ اکیڈمی دہلی سے غبار خاطر کا جو نسخہ مرتب کیا ہے جو پہلی بار ۱۹۶۷ء میں اور نویں بار ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا،اسمیں دیباچہ کے عنوان سے صفحہ نمبر۲ پر فارسی کا یہ شعر درج ہے:۔

(۱)میرس تا چہ نوشت ست کلک قاصر ما خط غبار من ست ایں غبار خاطر ما

اسی خط میں یہ دوسرا شعر بھی شامل ہے،

(۲)نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار بگزار کہ ایں نسخہ مجز اماند!

اورآخر میں نیشنل ایر لائین مابین کراچی جودھپور۲ فروری ۱۹۸۶ء درج ہے اور نیچے ابوالکلام لکھا ہوا ہے، مذکورہ غبار خاطر کے صفحہ ۳ پر نمبر(۱) **شملہ ۲۷ جون ۱۹۴۵ء** اور اسکے بعد فارسی کا یہ شعر درج ہے،

اے غائب ازنظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیان ودعامی فرستمت

پھر یہ عبارت ہے کہ دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبان درماندہ فرصت کو یارائے سخن نہیں مہلت کا منتظر ہوں ابوالکلام،غبار خاطر کے صفحہ۴ پر مکتوب **شری نگر** (۲) **ہائوس بوٹ شری نگر ۲۴ اگست ۱۹۴۵ء** درج ہے اسکے بعد فارسی کا یہ شعر لکھا ہے،

گہے از دست گاہے از دل وگاہے زپا مانم
بسرعت می روی اے عمر! می ترسم کہ دامانم

خط کا آغاز صدیق مکرم کے القاب سے ہوتا ہیا س خط میں فارسی کے تین اشعار اور ایک مصرع درج ہے دوسرا شعر فیضی کا ہے جو اس طرح ہے،

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر کہ بارعیش کشاید بخطۂ کشمیر

تیسرا شعر غالب کا ہے

باچوں توئی معاملہ برخیوش منت ست ازشکوۂ تو شکر گزار خودیم ما

تیسرا مصرعہ ہے،

مازندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

(۳) **مکتوب نسیم باغ ۳ ستمبر ۱۹۴۵ء** میں فارسی کے چار شعر اور دو مصرعے ہیں جو اس طرح ہیں،

(۱)از مامپرس درددل ما کہ یک زماں
خودرا بحلیہ پیش تو خاموش کردہ ایم

(۲)گرچہ دریم بیادتو قدح می نوشیم
بعد منزل نہ بوددرسفرروحانی

(۳)ایں رسم وراہ تازہ زحرمان عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ برنہ بود

ع۔دل دیوانہ دارم کہ درصحراست پنداری

----

(۴)شمۂ از داستان عشق شورانگیز ماست
ایں حکایتہا کہ از فرہادوشیریں کردہ اند

ع۔چشم سوے فلک وروئے سخن سوے تو بود

----

(۴) **مکتوب سفر بمبئی میل براہ ناگپور ۳ اگست ۱۹۴۲ء** میں گیارہ شعر اور تین مصرعے فارسی زبان کے شامل ہیں،

(۱)فیضے عجبے یافتم از صبح بیبید
ایں جادئی روشن رہ میخانہ نہ باشد

(۲)خوشش بادانسیم صبح گاہی
کہ درد شب نشیناں را دوا کرد!

ooo

آپ بیتی

یادیں

ہمارے زمانے میں شہزادیاں، امراء کی بیویاں، بہو بیٹیاں، تعلیم یافتہ خواتین تعلیمی اور سماجی میدان میں فلاحی خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔ ہم لوگوں کو سمجھایا اور سکھایا جاتا تھا کہ عورتوں کو اپنی گھریلو ذمہ داریوں کے بعد کچھ وقت باہر نکل کر عوام کی خدمت کریں۔ گھر کی چار دیواری کے باہر بھی ایک دنیا ہے اس دنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھنا اور پرکھنا چاہیے۔ میری مما Resident کی خواتین کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ شہزادی نیلوفر نے جنگ کے زمانے میں کئی کام کیے۔ کپڑے سلوا کر یہاں سے بھیجتی تھیں، سردیوں کے موسم میں بلانکٹس اپنی طرف سے بھیجتیں تھیں۔ اسی طرح شہزادی دُرّ شہوار نے بھی کئی کام کیے۔ بیگم ولی الدولہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی حیدرآباد سے پریسیڈنٹ تھیں۔ پائگاہ کی دیگر بیگمات بھی سماج میں آ کر کچھ نہ کچھ کام کیا کرتی تھیں۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ خواتین میں سماجی شعور پیدا کیا جائے۔ صرف گھر میں بیٹھے بیٹھے وقت گزاری کرنے اور ہمدردی کی باتیں کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ عملی طور پر بھی کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔ نام و نمود کی خاطر لوگ تقریریں کرتے، نعرہ بازی کر کے، اخبار کی سرخیوں کا حصہ بن کے اور صرف خوش گوار مشورے دینے سے کوئی کام نہیں بنتا۔ اس طرح ہماری فکری اساس، احساسات و جذبات اور نظریات زندگی کو نئی روشنی، نئی طاقت، نیا مطمع نظر ملتا ہے۔ خود ان خواتین کی جو عملی دنیا میں دلچسپی لیتی ہیں ان کی ذہنی طاقت کے ساتھ اندرونی شخصیت میں بھی نمایاں تبدیلیاں آتی ہیں ایک نئی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ آج کل تو بڑے گھر کی خواتین صرف اسٹیج کی زینت بنتی ہیں سماج کا مقابلہ نہیں کر سکتیں سماج کے لیے کوئی کام نہیں کرتیں ہمارے زمانے میں تو گورنرز کی بیویاں اسکول، کالجس کے علاوہ ادبی اور علمی اور فلاحی کاموں میں سامنے آتی تھیں پرنسس کو خاص طور پر دعوت دی جاتی تھی ممبرس انہیں اپنی طرف سے پھول پیش کرتیں جسے وہ بڑی محبت سے قبول کرتیں ان سے گھل مل جاتیں، بات چیت کرتیں، حال چال دریافت کرتیں تھیں جس سے خواتین میں خود اعتمادی پیدا ہوتی جارہی تھی ان کے ساتھ کام کر کے فخر محسوس کرتی تھیں آل انڈیا ویمنس کانفرنس میں شہزادیاں اعزازی سرپرست (Patron) ہوا کرتی تھیں۔ یعنی شہزادی درّ شہوار، شہزادی نیلوفر، شہزادی اسریٰ اور انوری بیگم صاحبہ ہماری Patron رہیں۔ معصومہ بیگم، بیگم ولی الدولہ، مما (رانی پرملا دیوی) اور ہم لوگ Paid ارکان تھے سالانہ -/300 روپے ممبر شپ فیس تھیں۔ اعزازی ممبر شپ کی فیس یکمشت دینا ہوتا تھا اس رقم سے کانفرنس کی طرف کیے جانے والے اجلاسوں اور کاموں کے اخراجات کی پابجائی کی جاتی تھی۔ کانفرنس کی طرف سے Learn & Earn ایک مہم شروع کی گئی تھی۔ ایک اسکول تھا جو آج بھی ہے اس کا مقصد تھا Learn One Teach One اس طرح سے بچوں میں ایک طرح کا جوش، جذبہ، علم سے دلچسپی اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ایک دفعہ ہم نے ایک عجیب وغریب قسم کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ وہ نمائش تھی ''مسند اگزی بیشن'' جس میں نظام کی مسندیں زیادہ شامل تھیں، پائگاہوں سے بھی مسندیں آئی تھیں ہمار ے یہاں سے بھی مسندیں گئی تھیں لیکن نظام کی مسندیں بہت عمدہ تھیں اور سب سے الگ تھیں۔ اگزی بیشن ختم ہونے کے بعد سب کی مسندیں ان سب کے پاس پہنچ گئیں مگر نظام کی مسندیں حضور کو

واپس نہیں ملیں پتہ نہیں بیچ والوں نے کیا کر دیا۔

آل انڈیا ویمنس کانفرنس 1926ء میں دلی میں قایم ہوئی تھی 1927ء میں اس کی ایک شاخ بیگم رستم جنگ نے حیدرآباد میں قایم کی تھی اس کی صدر تھیں، سروجنی نائیڈو، لیڈی حیدری، بیگم ولی الدولہ وغیرہ۔

اس کانفرنس اور ہماری شاخ کی طرف سے اجتماعی سطح پر کئی اہم کام ہوئے مثلاً 1928ء میں نابالغ لڑکیوں کی شادی کی روک تھام کے لیے، ''شاردا ایکٹ'' بل پاس کروایا گیا۔ گورنمنٹ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ سنٹرل لجسلیچرز میں خواتین کو بھی جگہ دی جائے۔ یہ مطالبہ رکھا گیا 1928ء میں اس کے فوری بعد یعنی 1929ء میں سوشیل ریفارم، ایجوکیشنل ریفارم Extra Curricular for Schools کے لیے ایک ڈرافٹ بنایا گیا نصابی کتابوں کی از سر نو ترتیب ہو اور تازہ نصاب پر غور کیا جائے سارے ہندوستان میں Condition of Teachers Training شروع کیا گیا۔ 1930ء میں Law of Inheritence پر کام کیا گیا یہ سب کچھ برٹش عہد کی کوششیں تھیں۔ ہندوستان بھر میں ان کاموں کے لیے ربط قایم کیا گیا اور اس پر بہت کچھ کام ہوا۔ اس کے بعد ویمن لیبرا یکٹ کے لیے ایک Delegation برلن (جرمنی) گیا اسی وقت مساویانہ شہرت کی بات چھڑی اور شاردا ایکٹ پر کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ آئے اس پُر زور محنت کی گئی۔ یہی وہ سال تھا جس میں Hindu Divorce Act پر کام کیا گیا اور Untouchability کے مسئلہ کو اٹھایا گیا۔ ہماری کانفرنس کی چند منتخب خواتین کو گول میز کانگرنس میں بھیجا گیا ان خواتین میں مسز سروجنی نائیڈو شامل تھیں ایک وفد وائسرائے کے پاس گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ بھی خواتین کو گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع دیا جائے۔ 1933ء میں لیڈی ارون کالج کا قیام عمل میں آیا۔ خواتین تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب ہوئیں انہیں جامعات بلدیہ اور دوسرے کارپوریشن میں جگہ ملنے لگی۔ 1934 میں ہمارا یہ مطالبہ کہ خواتین کو مساویانہ حقوق دیئے جائیں کامیاب نہ ہوسکا۔ تو کانفرنس کی طرف سے کچھ لوگوں کو Joint Parliamentary Committee میں بھیجا گیا۔ تاکہ پارلیمنٹ کو اس کا احساس دلایا جائے تمام ہندوستانی خواتین کا یہ مشترکہ مطالبہ ہے کہ خواتین کو زندگی کے ہر معاملہ میں مساویانہ حقوق دیئے جائیں اس حق کو حاصل کرنے کے لیے شادی شدہ ہونا ضروری نہیں تھا۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ (Women Disability) یعنی خواتین کی قانونی کمزوریوں کو دور کیا جائے راجکماری امرت کور کو وائس پریسیڈنٹ آف یونیسکو منتخب کیا گیا۔ آزادی کے فوری بعد یعنی 1947ء میں انڈین ویمن کانفرنس کو UNO میں مستقل پوزیشن دیا گیا۔

آزادی سے پہلے اور بعد میں بھی کانفرنس نے بہت سارے کام انجام دیئے۔ آزادی ملی ملکی آئین تیار کیا، ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک بنا۔ خواتین میں ایک نیا جوش، نیا ولولہ، خود اعتمادی پیدا ہوئی اب وہ بڑی ہمت کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں۔ مہاتما گاندھی کا خواب پورا ہوتا نظر آیا جہاں اونچ نیچ کا کوئی بھید بھاؤ تھا۔ سارے طبقات میں مساوات کا شعور پیدا ہوا خواتین کو بھی وہ حقوق ملے جو مردوں کو حاصل تھے اس وقت مسز اندرا گاندھی کو بھی کانفرنس میں شریک کر لیا گیا۔

آل انڈیا ویمنس کانفرنس نے اب اپنے مقاصد کو کچھ اور وسعت دی 1954ء میں Special Marriage Act، 1955ء میں Hindu Marriage Act، 1956 میں Hindu Minority and Guardianship Act، Hindu Maintenance Act اور پھر اس کے بعد Inter State Succession پھر Orphange، Widow Home Act پر عمل

آوری ہوئی 1961ء میں Divorce Act پر کامیابی حاصل ہوئی۔

آج ہندوستان میں تین بڑی خرابیاں ہیں جو ہماری ترقی وتہذیب پر ایک بدنما داغ ہیں تعلیم کی کمی، غربت اور آبادی ہم نے ان ہی کے خلاف آزادی سے پہلے جدو جہد کی ہم نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ خواتین کو کانوں (Mines) میں اندر کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے یہ ایک بڑا اہم مسئلہ تھا جس سے کئی مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ ایک اور اہم ریزولوشن کانفرنس نے پاس کیا کہ برتھ کنٹرول کا علاج مستند اور اچھے دواخانوں میں ہوتا کہ خواتین اس نئے پیدا ہونے والے خراب اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔ اوپر یہ بتانا بھول گئی کہ 1936ء میں ٹراونکور کے مندروں کو سب کاسٹ کے لیے کھول دیا گیا ساتھ ہی ساتھ Inter Cast Marriages کو مستند مانا گیا۔ بین الاقوامی سطح پر ہندوستان اور خاص طور پر ہندوستانی خواتین کو سیاسی سماجی، قانونی تعلیمی، مساویانہ حقوق کو قانونی حیثیت حاصل ہوگئی کیوں کہ لیگ آف نیشن نے اس پر بہت زور دیا تھا۔ 1937ء میں ایک دھما کا خیز تبدیلی یہ آئی کہ مختلف صوبوں سے سات خواتین کو لیجسلیچرز کے لیے منتخب کیا گیا مسز وجئے لکشمی پنڈت Elected کیبنیٹ منسٹر چنی گئیں جس سے معلوم ہوا کہ ہندوستانی خواتین ہر میدان میں برابری کا حصہ ادا کر سکتی ہیں ہماری بعض خواتین منسٹر، ڈپٹی اسپیکر اور پارلیمنٹری، سکریٹری بھی بن سکیں۔ 1945ء میں ورلڈ وار ختم ہوئی تو کانفرنس نے ایک منشور (Charter) کا ڈرافٹ تیار کیا۔ 1946ء میں Human Rights Commission پر ہندوستان کی طرف سے نمائندگی کی گئی۔ وجئے لکشمی پنڈت U.N.O. کو گئیں یہ ہندوستان کی پہلی خاتون تھیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔

ہماری بہت بڑی آبادی کا ایک بہت بڑا مسئلہ بیروزگاری ہے گورنمنٹ کو بھی اس کا احساس ہے مگر ہر پڑھے لکھے شہری کی بھی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ مل جل کر اس بوجھ کے حصہ دار بنیں۔

کانفرنس نے جتنے بھی اہم کام کیے اس کے لیے فنڈس کی اشد ضرورت ہوتی تھی ہم مختلف طریقوں سے چھوٹے چھوٹے فنڈس جمع کرتے تھے مثلاً وار کے زمانے میں ہمیں ایک ویان دی گئی تھی۔ جس کی دیکھ ریکھ ہماری ذمہ داری تھی پٹرول، ڈرائیور، نرس، ڈاکٹرز دوائیں وغیرہ۔ ہمیں Maintain کرنا پڑتا تھا۔ یہ ویان گاؤں گاؤں جاتی تھی گاؤں والوں کا میڈیکل چک اپ فری ہوتا تھا۔ اس دن جس دن باری ہوتی تھی گاؤں والے بے چینی سے درخت کے نیچے بیٹھے ویان کا انتظار کرتے تھے۔ ان کا چک اپ ہوتا دوائیں فری دی جاتی تھیں اور پھر خبر گیری بھی کی جاتی تھی کبھی ویان خراب ہو جاتی اور میڈیکل اسٹاف نہیں جا سکتا تو وہ لوگ بڑے مایوس ہو جاتے تھے۔

تعلیمی میدان میں ہمارے پاس ایک اسکول تھا جو اب بھی ہے جس کی عمارت لیلا وتی نائیڈو مسز سروجنی نائیڈو کی چھوٹی بیٹی نے دی تھی اس عمارت کو تھوڑا بہت ہم نے آگے بڑھایا مرمت کی اسکول کی ضروریات کے مطابق کچھ نہ کچھ اضافہ کیا۔ پانچویں کلاس تک مفت تعلیم دی جاتی تھی دوپہر کا کھانا بھی دیا جاتا تھا۔ ٹیچرس کے انتخاب میں ہم نے بڑی احتیاط برتی تعلیمی معیار کے ساتھ ساتھ ان کے کردار، صبر وضبط اور ایثار ومحبت کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا تاکہ غریب طبقے کے بچوں کے ساتھ ان کا سلوک نارِوانہ ہو۔ گلی کوچوں سے بچوں کو پکڑ پکڑ کر لاتے تھے ان سے ان کے والدین سے کونسلنگ کر کے انہیں پڑھائی کی طرف راغب کرتے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ان بچوں میں سے بعض کے پاس چھوٹے چھوٹے چاقو ہوا کرتے تھے۔ ان کی تعلیم کے ساتھ تربیت بھی کرتے تھے۔ تمیز وتہذیب سکھائی جاتی تھی دوپہر کے کھانے کے وقت ٹیچرز دیکھتے تھے بچوں نے ہاتھ دھویا کہ نہیں۔

کھانا تمیز سے کھا رہے ہیں کہ نہیں۔ گفتگو کا طریقہ کیا ہے وغیرہ تعلیم کے ساتھ کھیل کود کی طرف بھی توجہ کی گئی اور کچھ نہ کچھ ہنر بھی ضرور سکھاتے تھے تا کہ آئندہ زندگی میں وہ عزت سے کچھ کما سکیں پانچویں کے بعد ہمارے اسکول میں کلاسس نہیں تھیں تو ہم انہیں ان کے قریبی اسکولوں میں داخلہ دلا دیتے تھے۔Follow Up میں ہم نے دیکھا کہ یہ بچے پڑھ لکھ کر کوئی تجارت میں لگ گیا ہے کوئی خاندانی پیشہ سے وابستہ ہو گیا ہے۔ بڑی محبت سے وہ بچے بڑے ہو کر ہم سے ملنے آتے اور ممنونیت کا اظہار کرتے تھے۔

تین مہینے میں ایک دفعہ ہماری عاملہ کی میٹنگ ہوتی تھی اس کے لیے ہمارے پاس کوئی مختص ہال نہیں تھا تین مہینے میں ایک دفعہ کسی نہ کسی ممبر کے گھر پر یہ میٹنگ ہوتی تھی۔ سال میں ایک دفعہ شہزادی اسریٰ کے پاس بھی میٹنگ ہوتی تھی جس کے لیے وہ بڑا اہتمام کرتی تھیں۔ میٹنگ کے نو ممبر تھے چار کا کورم تھا کورم پورا نہ ہو تو میٹنگ ملتوی کر کے میٹنگ کی تکمیل کی جاتی تھی۔ جنرل باڈی میں مختلف قسم کے لوگ تھے ان کی تعداد غالباً 100 تھی اس میں ہمارے اسکول کے ٹیچرز بھی شامل تھے۔ جنرل باڈی میٹنگ کا خرچ بھی کانفرنس اٹھا نہیں سکتی تھی اسی کے لیے بھی وہ طریقہ تھا جو عاملہ کا تھا۔ گیان باغ میں یہ میٹنگ ہوا کرتی تھی سبھی لوگ بڑے شوق سے آتے تھے محترمہ معصومہ بیگم، مسز انصاری، مسز گل چینائی، مسز سباسٹین، مسز وہاب، مسز انیس محمود بن محمد، پرنسس اسریٰ ہماری سرپرست تھیں ان سے پہلے پرنسس دُرِّشہوار، پرنسس نیلوفر بھی آنرری سرپرست رہیں۔ ان لوگوں کا طریقہ زندگی بڑا خوب صورت تھا، انہیں پھول بھیجے جاتے تو اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر شکریہ ادا کرتی تھیں۔ ہمیں لوگوں ملنے جلنے کے آداب اور اخلاق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ کبھی فنڈس جمع کرنے کے لیے ہم نے IKEBANA پھولوں کی نمائش کی تھی یہ ایک جاپانی طریقہ ہے اس کے لیے جاپان سے لوگ آ کر نہ صرف نمائش کی ترتیب میں مدد دیتے تھے بلکہ ہمیں یہ ہنر سکھاتے تھے۔

آل انڈیا ویمنس کانفرنس کا جب کوئی اجلاس دیگر ریاستوں میں ہوتا تھا تو وہاں رجواڑے بھی آتے تھے، کھانا پر بلاتے، مہمان نوازی کرتے، تحفے تحائف دیتے تھے ہماری جب آخری کانفرنس ہوئی تھی تو شہزادی اسریٰ نے چومحلہ میں پانسو لوگوں کو ڈنر پر بلایا تھا۔ کانفرنس کی طرف سے کبھی کبھی منتخب خواتین کو بیرون ملک بھی بھیجا جاتا تھا اس طرح کوئی جاپان گیا کوئی چین ان ممالک کے ویمن Organisation ہم سے منسلک ہوتے تھے۔

ہماری کانفرنس سے جڑی خواتین نے نام ونمود کی خاطر کانفرنس کی شہرت قبول نہیں کی انہوں نے کئی اہم کارنامے انجام دیئے۔ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر بھی کانفرنس کے کاموں سے دلچسپی لیتی رہیں۔

ہماری جنرل باڈی کی ممبرس عام خواتین بھی تھیں سال میں ایک دفعہ اندر آ کر وہ فخر محسوس کرتیں خوش ہوتی تھیں ان کا سالانہ چندہ اسّی روپئے تھا۔ ہماری کانفرنس کی خواتین میں سے محترمہ معصومہ بیگم، مسز پلا ریڈی، رانی کمودنی دیوی (ونپرتی)، روڈا مستری یہ سب یہیں سے سیاست میں گئی ہیں۔ معصومہ بیگم صاحبہ نے مجھے اور پرنسس اسریٰ کو ایک ہی وقت میں کانفرنس میں لیا تھا۔

OOO

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔ جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

مہتاب قدر

سفرنامہ

آوارگی تھوڑی سی (دوسری قسط)

دوسرے روز طے شدہ پروگرام کے مطابق دن بھر مقالات اور نثری نگارشات سے مستفید ہوتے رہے اور شام کی ساعتوں میں اسکوپ کے وسیع و عریض ہال میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرے میں بیرونی سفیران شعر وادب کے علاوہ مقامی شعرا بھی شامل تھے، ڈاکٹر احمد علی برقی (جن کی شعرگوئی برق رفتاری کے لئے مشہور ہے) ان کی آمد سے استفادہ کرتے ہوے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ہند و بیرون ہند مشاعرے پڑھنے والے معروف مقامی شعرا میں معین شاداب اور اقبال اشعر بھی آج کی شعری نشست میں شریک تھے، خواتین میں ڈاکٹر قمر سرور اور صدف اقبال نے اپنا کلام سنایا۔ نظامت عمومی اندازے کے مطابق زاہد الحق یا معین شاداب کو کرنی تھی مگر بعد میں عقدہ کھلا کہ فال کسی اور کے حصہ میں نکلا ہے، چنانچہ مشاعرے کی نظامت دبئی سے تشریف لانے والے مہمان شاعر و ادیب ظہورالاسلام جاوید نے فرمائی۔ مشاعرے کے سامعین میں ایک بہت جانا پہچانا چہرا سامعین کی آخری صفوں میں نظر آتا رہا سوچا کہ مشاعرے کے فوراً بعد ملاقات کروں گا مگر اختتام پر میرے قدیم دوست ارشد غازی سے ملاقات نہ ہوسکی موصوف جدہ کے قیام کے دوران مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہوا کرتے تھے جنہیں شاعری اور علم و دانش کا ورثہ اپنے آباو اجداد سے ملا ہے جن کے والد مولانا حامد الانصاری غازی اور نانا مولانا طیب قاسمی ہوں ان کی خوش قسمتی کے کیا کہنے! والدہ ہاجرہ نازلی مشہور ناول نگار اور برادر خورد طارق غازی جو ان دنوں کینیڈا میں مقیم ہیں جن سے ہماری بھی بہت خوب ملاقاتیں جدہ میں انکے قیام کی یادگار ہیں، بلکہ طارق غازی ان محسنین اردو ادب میں سے ہیں جنہوں نے جدہ کے ابتدائی مشاعروں کی رپورٹیں اپنے انگریزی اخباری سعودی گزٹ میں بڑے دھڑلے سے شایع کیں اس وقت تک جدہ سے کوئی اردو اخبار شائع نہیں ہوا تھا موصوف حلقہ ارباب ذوق جدہ کے سرپرستوں میں شامل رہے۔ ارشد غازی دلی میں ہی غالباً مقیم ہیں اختتام پر نظرں ہیں آے۔ آن لائن رابطہ ہوا تو معلوم ہوا کہ کوئی بدذوق سامع ان کے قریب بیٹھا تھا جس کی وجہ سے طبیعت پر بوجھ ہوا تو وہ اٹھ کر چلے گئے تھے مشاعرے کے بعد پھر ایک شعری نشست میں شرکت کرنی تھی جو بطور خاص میرے لئے دلی کے بزرگ شاعر ابرار کرتپوری کے دولت خانے پر سجائی گئی تھی۔ برادرم سکندر عاقل کے ہمراہ ہم وہاں پہنچے تھے۔ محفل میں چند نئے چہروں کے علاوہ شکیل جمالی، حنیف ترین، سلمی شاہین، چشمہ فاروقی، ڈاکٹر برقی اعظمی سعید منتظر جیسی مخلص شخصیتیں تشریف فرما تھیں۔ مشاعرہ بزرگ کے دیوان خانہ میں منعقد ہوا، جو اپنی تنگ دامنی کے سبب ناکافی محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر حنیف ترین ریاض میں عرصہ تک مقیم رہے اب واپس لوٹ گئے ہیں، گزشتہ دنوں موصوف سے طائف کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی شومئی قسمت وہ مشاعرہ ہماری صدارت میں منعقد ہوا تھا، نسیم سحر جیسی کہنہ مشق شاعر کی موجودگی میں اہل طائف کا اصرار تھا کہ میں صدارت کروں، جدہ سے ناصر برنی بھی میرے ساتھ تشریف لاے تھے، بہرحال مشاعرہ تو جیسے تیسے گزر گیا البتہ حنیف ترین کے رویہ سے لگا کہ سعودی عرب میں نسیم سحر اور انکے علاوہ کوئی بڑا شاعر نہیں ہے۔ یہ بات ناصر برنی کو بہت بری لگی تھی وہ جواب دینا چاہتے تھے مگر میری التجا کے باعث چپ ہوگئے۔ یہاں ملاقات ابرار کرتپوری کے دولت خانے پر ہوئی۔ حنیف ترین اپنی شاعری بہت ناچتے گاتے سناتے ہیں اور لوگ ان کی شاعری سے زیادہ انکی

حرکات وسکنات کا لطف لیتے ہیں، گلپوشی کا سلسلہ بھی رہا اور ابرار کرتپوری صاحب نے اپنی شعری تصنیفات کا ایک خاص حصہ مجھے از راہ کرم عنایت فرمایا۔ ڈاکٹر سلمی شاہین بھی موجود تھیں، وہاں ان سے تعارف نہ ہو سکا بعد میں بہار آئیں تو ملاقات اور تعارف ہوا۔ البتہ چشمہ فاروقی نے اپنی غزل پیش کی جس سے ان کی شعری نوآموزی کا اندازہ ہوا موصوفہ کسی ادبی میگزین کی مدیرہ بتائی گئیں، بہت مخلص اور سیدھی سادی خاتون تھیں۔ پرتکلف عشائیہ کیبعد رات دیر گئے ہم کرم فرما سکندر عاقل کے ساتھ ہی اشوکا ہوٹل واپس پہنچے۔

تیسرے دن کے پروگرام کی تفصیل سے قبل کچھ اور ساتھیوں کا ذکر کرتے چلیں جن کا ساتھ لازوال لمحوں کی شکل میں یادگار اثاثہ بن گیا۔

ڈاکٹر زاہد الحق: زاہد الحق ہیں تو عظیم آباد کے ہی مگر ان کے نام کے ساتھ حیدرآباد آج کل جزلاینفک کی طرح جڑ گیا ہے، ان کا تذکرہ حیدرآباد کے ساتھ اس لئے بھی کیا جاتا ہے کہ ہونہار زاہد الحق آج کل حیدرآباد یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے ممتاز استاذہ میں شامل ہیں۔ نظامت کے لئے بہت موزوں ترین شخص جسے شعرا اتنے یاد ہیں کہ جب وہ تواتر سے پڑھتے ہیں تو ہمیں مرحوم باکمال ناظم مشاعرہ ثقلین حیدر کی یاد آجاتی ہے۔ اپنے بزرگوں کا احترام کرنا کوئی ان سے سیکھے، خود بھی بہت محترم مگر زندہ دل انسان اپنے ساتھیوں میں عزیز ہیں دشمنوں کا پتہ نہیں اللہ کرے کوئی ان کا دشمن نہ ہو اور انہیں کسی کی نظر نہ لگے، شعر پڑھتے ہیں تو لگتا ہے ہیرے موتی لٹا رہے ہوں۔ زاہد الحق دلی پٹنہ بتیہ کولکتہ سے حیدرآباد تک پورے سفر میں اپنی محبتیں تقسیم کرتے رہے۔

محترم ظہورالاسلام جاوید: خلیجی شعرا اور خلیج میں اردو کی آبیاری کرنے والوں میں ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ پڑوسی ملک سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے دلی تک آسکے ہمارے ساتھ بہار اور کولکتہ کا ویزا نہ ملنے کی وجہ سے دلی میں رک گئے اور انکے لئے اہل دہلی نے مزید پذیرائی کی تقاریب منعقد کیں۔ کم گو ہیں مگر رخ روشن، لب خنداں نگہہ کیف اثر لئے جہاں جاتے ہیں دلوں میں اتر جاتے ہیں۔

احمد اشفاق: احمد اشفاق سے ہمارا قلبی تعلق بھی ہے اگرچہ کہ ہمیں کسی بھی سلسلے سے خلافت کی دستار میسر نہیں مگر دل والوں میں ہم احمد اشفاق سمیت اپنے آپ کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ موصوف ہماری خلیجی تنظیم گلف اردو کونسل میں قطر کے ذمہ دار ہیں۔ تسلیم عارف بھی اردو کونسل کے پورے پروگرام میں بہتر طور پر اپنی رضاکارانہ خدمات انجام دیتے دکھائی دیئے جن سے جدہ آمد کے موقع پر ملاقات ہو چکی تھی بہت خوش مزاج انسان ہیں۔

دوسرے دن جس اجلاس میں مجھے اپنا مقالہ پیش کرنا تھا میں سامعین کی تیسری صف میں بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک خاتون میری برابر والی کرسی چھوڑ کر تیسری کرسی میں آ بیٹھیں بیچ کی کرسی پر انہوں نے اپنا پرس اور کوئی رسالہ وغیرہ رکھ دیا، میں نے مڑ کر انکی جانب دیکھا تو چہرا کافی شناسا لگا انہوں نے مسکراہٹ سے استقبال کیا پھر تعارفی گفتگو ہوئی نام بتایا تو یاد آیا کہ ان سے نہ صرف واٹساپ پر رابطہ رہا ہے بلکہ انکے تنقیدی مضامین شعروسخن والی ویب سائٹ پر پڑھے بھی ہیں بہت خوب تنقیدی جائزہ لیتی ہیں شعروادب کا سویہ تھیں ڈاکٹر ہاجرہ بانو جن کی آن لائن تصویر اور حقیقی تصور میں ذرا سا فرق تھا، پتہ چلا کہ وہ بھی مقالہ پڑھ رہی ہیں سو طے ہوا کہ جب میں پڑھوں وہ تصویر بنا کر واٹساپ کردیں گی اور جب وہ پڑھیں میں انکی تصویر لے کر انہیں واٹساپ سے بھیج دوں گا، اب وہ ایک موقر علمی ادبی رسالہ بھی نکال رہی ہیں۔

کانفرنس کے دوران عمران عاکف خان بھی ملے اور اپنا تعارف کروایا عمران عاکف دھان پان قسم کے ایک سیدھے سادے نوجوان قلمکار ہیں خوب لکھتے ہیں، ای میل کے ذریعے موصوف کے مضامین کافی دنوں سے موصول ہوتے رہے ہیں جنہیں پڑھ کر انکی پختہ فکر اور قلمی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں نا! جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اور اگر جادو کا تعلق بنگال سے ہو پھر دلی کی رہائش تو اس کا نام شاہینہ حسن ہو سکتا ہے۔ ایک جاذب نظر لڑکی دیگر خواتین کے ساتھ ملی اپنا تعارف بھی کروایا اور خواہش کی کہ ان سے واٹساپ پر رابطہ رکھا جائے میں نے دریافت کیا، شعر کہتی ہو یا نثر سے کوئی تعلق ہے، کچھ لکھتی ہو! جواب نفی میں ملا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہینہ حسن کتنی شریف لڑکی ہے حالانکہ اس عمر کی لڑکیاں تو آجکل مشاعروں کی زینت بننا پسند کرتی ہیں اور جلد ہی اسٹیج کے ذریعے دلوں میں داخلہ پا کر مال بھی کماتی ہیں اور شہرت بھی۔ شاہینہ ایک باذوق قاری اور خوبصورت سماعتوں والی ادب دوست باوقار لڑکی ہے، تدریس کے پیشے سے منسلک ہے اور اسی میدان میں ترقی کے خواب سجائے رکھتی ہے۔ عمران عاکف کے ساتھ ملیں تو عمران نے ان سے اپنا تعلق جتاتے ہوئے کہا کہ ہم دونوں ایک ہی ہیں، عمران کا اشارہ بھانپتے ہوئے شاہینہ نے فوراً انکار کر دیا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہم صرف دوست ہیں۔

تیسرے دن پھر اسکوپ کا ہال اپنی فکری اور ادبی لطافتوں کا مظہر بنا رہا۔

تیسری صبح باقی ماندہ پروگرام حسب ایجنڈا منعقد کئے گئے پھر دوپہر کو مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کی سرپرستی میں اختتامی اجلاس ہوا۔ وزیر محترم نے اردو سے بے پناہ لگاؤ اور سیکھنے کے اشتیاق کا اظہار فرماتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم سے ان کے لئے اردو کے استاد کی تقرری کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اردو بول رہے تھے اور اردو کی چوتھی عالمی کانفرنس کا اختتامی پروگرام اپنے مراحل پورے کر رہا تھا۔ وزیر موصوف بہت ہشاش بشاش تھے اردو والوں اور اردو کی فسوں کاری نے ان پر اچھے اثر تیسری صبح باقی ماندہ پروگرام حسب ایجنڈا منعقد کئے گئے پھر دوپہر کو مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کی سرپرستی میں اختتامی اجلاس ہوا۔ وزیر محترم نے اردو سے بے پناہ لگاؤ اور سیکھنے کے اشتیاق کا اظہار فرماتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم سے ان کے لئے اردو کے استاد کی تقرری کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اردو بول رہے تھے اور اردو کی چوتھی عالمی کانفرنس کا اختتامی پروگرام اپنے مراحل پورے کر رہا تھا۔ وزیر موصوف بہت ہشاش بشاش تھے اردو والوں اور اردو کی فسوں کاری نے ان پر اچھے اثرات مرتب کئے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اردو کی طرفداری اور کارہائے نمایاں میں اپنی شرکت اور تعاون کا یقین دلایا۔ مہمانوں اور وزیر محترم کے درمیان گلدستوں کی پیشی اور وصولی کا دور چلا پھر مہمانوں کو تمغے اور شہادت نامے عطا کئے گئے۔ ہر انعقاد اپنے اختتام کو پہنچتا ہے سو یہ شاندار کانفرنس اپنی پوری توانیاں بکھیرتے ہوئے اختتام پذیر ہوئی بلکہ یوں کہا جائے کہ پانچویں عالمی اردو کانفرنس کیا علان تک کے لئے ملتوی کی گئی۔

یہ تھی اس دلی کی داستان سفر جو عالم میں انتخاب تھا جو لٹتا رہا بکھرتا رہا اجڑتا رہا مگر دلی آخر دلی ہے اردو کی طرح سخت جاں اس لئے کل بھی آباد ہوتا رہا اور آج بھی آباد ہے۔ اردو بھی کل شاداب تھی آباد تھی اور آج بھی اردو کے چرچے دنیا بھر میں ہو رہے ہیں، جس کا ثبوت اس کانفرنس میں شریک جرمنی انگلینڈ کنیڈا ترکی ایران سعودی عرب موریشیس سمیت اٹھارہ ملکوں سے شریک ہونے والے محبان اردو ہیں۔ خبر تو یہاں تک ہے کہ چین اور مصر میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے، اور اردو کے ترجمے بھی مقامی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ گویا، اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ۔

چلئے اب تاریخی شہر عظیم آباد چلتے ہیں!!

جی ہاں ہندوستان کے مایہ ناز فارسی شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کے شہر عظیم آباد جہاں وہ پیدا ہوئے اور پھر بعد میں دلی جا کر قیام فرمایا۔ عظیم آباد برطانوی راج سے قبل اٹھارویں صدی کے دوران پٹنہ کا نام تھا، جو موجودہ دور میں ریاست بہار کا دارالحکومت ہے۔ اس کا قدیم نام پاٹلی پوترا بھی تھا۔ اس سے قبل یہ گپتا سلطنت اور سلطنتِ موریہ کا دار الحکومت رہا ہے۔ 1703ء شہزادہ ''عظیم

الشان'' جو مغلیہ حکمران اورنگزیب عالمگیر کا پوتا تھا گورنر بن کر پاٹلی پوترا آیا۔ شہزادہ عظیم الشان نے پاٹلی پوترا کا نام 1704ء میں تبدیل کر کے عظیم آباد رکھ دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ اپنے زمانے میں شاہ رُکن الدین، راسخ عظیم آبادی، محمد باقر حزیں، راجا رام نرائن موزوں، مہاراجہ کلیان سنگھ، نواب محمد علی خاں نے یہاں بڑی بڑی محفلیں آراستہ کیں۔

پٹنہ یعنی عظیم آباد کے ساون میلہ پر داغ دہلوی نے کہا تھا،

''جو اِک چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں''

دلی سے پٹنہ کو عالمی کانفرنس میں شریک ہونے والے بیرونی مندوبین کی ایک بڑی تعداد مدعو تھی، سو ہمارا قافلہ بھی جس میں میرے علاوہ جاوید دانش، پروفیسر ناز قادری کے فرزند ارجمند شہاب الدین احمد چیئرمین صدف انٹرنیشنل اور ڈاکٹر وفا یزدان منش شامل تھیں بذریعہ ہوائی جہاز ساون کی صورت عظیم آباد پہنچ چکا تھا، ائرپورٹ اور جہاز کی اڑان کے دوران ہم چاروں رفقا میں نہ صرف گفتگو کا خوبصورت موقع میسر آیا بلکہ وفا یزدان کے بادام بھی کھانے کو ملے، ایرانی بادام اپنی لطف اندوزی میں دیگر باداموں سے قدرے مختلف لگے یہ بادام کی تاثیر تھی یا ڈاکٹر وفا کے خلوص کا اثر اس کا فیصلہ میں تنہا نہیں کرسکتا دیگر ساتھیوں بلکہ وفا سے بھی پوچھنا ہوگا۔ وفا نے وعدہ کیا کہ مزید بادام کسی اور سفر کے دوران کھلائیں گی مگر اس کی نوبت نہ آنے میں وفا کا کوئی قصور نہیں ہیا اس کے ذمہ دار پروفیسر صفدر امام قادری ہیں اس واقعہ کا ذکر بہار سے کولکتہ جانے والی ٹرین کے سفر میں آئے گا۔ صفدر امام قادری صاحب اور ''سہ ماہی صدف انٹرنیشنل'' کی معاون مدیرہ افشان بانو ہمارے قافلے کے استقبال میں پٹنہ ائرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔ ہمیں بہار اردو اکیڈمی کے عین روبرو رٹز ہوٹل میں ٹہرایا گیا، مشہور زمانہ خدابخش لائبریری بھی اکیڈمی کے دفترے سے متصل ہی تھی۔

یہاں پہنچے تو خلیج کے مزید دوستوں سے ملاقات ہوئی مگران کا ذکر کرنے سے پہلے سکٹری اردو اکاڈمی کا ذکر ضروری ہے کہ یہاں وہی میر کارواں تھے۔ ساتھ ہی پروفیسر صفدر امام قادری کا ذکر بھی ناگزیر ہے کہ موصوف صدف انٹرنیشنل کے تمام پروگراموں میں بے حد معاون اور متحرک ہیں۔

مشتاق احمد نوری اسم بامسمی یعنی نورعلی نور شخصیت کیا لک ہوتے ہوئے بھی، نوری ہیں نہ ناری ہیں یعنی وہ آدم خاکی ہیں جسے نوریوں نے سجدہ کیا اور ناری نے انکار، موصوف اردو اکاڈمی بہار میں سکرٹری کے منصب پر فائز ہیں۔ طبیعت میں افسری کا عنصر بھی نمایاں ہے اور اردو کی خدمت تو ان کا سرکاری پیشہ ہے ہی، ذاتی طور پر بھی بہت خلیق واقع ہوے ہیں مزاح کے ساتھ سنجیدگی کا امتزاج ان کی شخصیت میں نکھار کا سبب ہے۔ شوخی ہر فنکار کا پیدائشی حق ہوتا ہے سو مشتاق احمد نوری کی ذات بابرکات بھی متشرع ہونے کے باوجود کہیں کہیں شوخی پر اتر آتی ہے تو کسی کا مصرع یاد آتا ہے۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ علم جنات اور جنیات دونوں پر خاصا عبور رکھتے ہیں ان سے کوئی پنگا لے تو کان میں (خود انکے بقول) جن چھوڑ دیتے ہیں۔ اتنا جاننے کے بعد کون ان سے گھسم گھسی کرسکتا ہے۔ اکاڈمی کے معاملات میں بہت سنجیدہ رہتے ہیں اس لئے بہار اردو اکاڈمی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ایک بار کھانے کی میز پر چلّو میں پانی پینے کی تعریف 'ڈفنیشن' بیان کرتے ہوے وفا یزدان سے پوچھ بیٹھے، اگر آپ نے چلّو میں کبھی پانی نہیں پیا ہے تو ہم پلا سکتے ہیں۔ اس بات کو وفا یزدان نے کیا سمجھا خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔

صفدر امام قادری: قلندر مزاج پروفیسر صفدر امام قادری صوفی منش (مگران کی وفا یزادان منش سے کوئی رشتہ داری نہیں) بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ جن کے تلامذہ میں ڈاکٹر زاھد الحق جیسے ہونہار موجود ہوں، جن کے طلبا انکی آنکھوں کے اشاروں کے منتظر رہتے

ہوں اس شفیق استاد کے کیا کہنے، فی زمانہ ایسے اساتذہ میسر کہاں ہیں۔ ادب پر گفتگو کریں تو لگتا ہے درد اور فکر میں ڈوبی آواز رک رک کر بلکہ اندر اٹھنے والے طوفان کو روک روک کر ہدایات اور مشورے دے رہی ہے۔ بات کم کام زیادہ کے قائل نظر آتے ہیں اور خود بھی یہی کرتے ہیں۔ انہی کی نگرانی میں شہاب الدین احمد نے بے شمار کتابوں کی اشاعت کو ممکن بنایا ہے وہ صدف انٹرنیشنل کے ڈائرکٹر بھی ہیں اور ماموں ہونے کے سبب شہاب الدین احمد چیئرمین صدف انٹرنیشنل کے سرپرستوں میں بھی گنے جاسکتے ہیں۔

''یہ بستی اب بھی بازار ختن ہے باکمالوں سے۔۔۔غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے''

(فضل حق آزاد عظیم آبادی)

خلیجی دوستوں میں ندیم ماہر اور عتیق انظر بھی پٹنہ میں ہمارے قافلے سے آملے تو سفر کا مزہ دوبالا ہوگیا۔

ندیم ماہر: مولوی صاحب ہمارے دیرینہ دوست ہیں اور بہت علمی اور ادبی حیثیت کے مالک بھی۔ ان سے پہلی بار بھی ملے تو لگا نہیں تھا کہ پہلی بار ملے ہیں، سنا ہے جو روحیں عالم ارواح میں مل چکی ہوں ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے علیگڑھ تک کے علمی سفر نے انہیں کندن بنا دیا ہے۔ گفتگو میں بھی شائستہ اور شاعری بھی بہت خوبصورت۔ قطر کے کسی سرکاری ادارے میں اہم منصب پر فائز ہیں۔ پہلی مرتبہ عمرے پر آمد کے سبب ملاقات ہوئی تھی اور دوسری بار گلف اردو کونسل کے دوروزہ پروگرام میں شرکت فرمائی، سفر ہند میں ساتھ ہوا تو ملاقاتوں اور تبادلہ خیال کے مواقع نصیب ہوے۔ میرے عزیز دوستوں بلکہ چھوٹے بھائیوں میں شامل ہیں اگر چہ شعر و ادب میں مجھ سے زیادہ قد آور ہیں۔

عتیق انظر: قطر سے تشریف لانے والوں میں عتیق انظر سے آن لائن رابطے میں رہنے کے باوجود ملاقات کا شرف پہلی بار اسی سفر میں حاصل ہوا، موصوف کی پر کشش شخصیت کو کم گوئی نے مزید دلچسپ بنادیا ہے۔ عتیق انظر کا تعلیمی پس منظر بھی دینی جامعات سے رہا ہے اس لئے بردباری ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی ہے۔ مخلص دوست اور بہت اچھے شاعر ہیں۔ قطر میں اردو کی ابیاری کرنے والوں میں ایک پرانا نام ہے عتیق انظر کا جنہیں کئی تنظیموں سے وابستگی کا شرف بھی حاصل ہے۔

ڈاکٹر واحد نظیر سے جدہ آمد پر ملاقات ہوئی تھی جب وہ بزم صدف انٹرنیشنل قطر سے اپنا ایوارڈ حاصل کرکے عمرہ کیلئے حجاز مقدس تشریف لاے تھے۔ عظیم آباد سے تعلق رکھتے ہیں مگر آجکل جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اسی لئے غالب کی دلی میں مقیم ہیں۔ سفر میں دلی پٹنہ بیتیہ سے کولکتہ تک ساتھ رہے، کم گو ہیں مگر اختصار پسند طول نویس نہیں۔ بعض اجلاسوں کی باوقار علمی انداز میں نظامت بھی فرمائی کم بولتے ہیں، اکثر زیر لب مسکراتے ہوے ہی دیکھا ہے۔

صغیر افراہیم: مدیر تہذیب الاخلاق علیگیڈھ (تہذیب الاخلاق معاشرتی اور اصلاحی ماہنامہ ہے جسے سرسید احمد خان نے انگلستان سے واپسی پر 24 دسمبر، 1870ء کو علی گڑھ سے جاری کیا) محترم صغیر افراہیم سے رٹز ہوٹل میں ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی۔ بہت انکسار کی کیفیت سجاے مدیر تہذیب الاخلاق نے اپنے رسالے کی کاپیاں عنایت کیں، افسوس کہ میں اکثر تحفے جدہ نہ لاسکا البتہ حیدرآباد میں محفوظ کرلی ہیں کہ آئیندہ سفر ہوتو ان شاللہ گھر پر ایک چھوٹی سی سہی لائبریری کی ترتیب عمل میں آسکے گی۔ ڈاکٹر صغیر سے پھر ملاقات ہوئی یا نہیں ذہن میں نہیں ہے کیوں کہ ہم لوگ شہاب الدین احمد کی قیادت میں بھاگم بھاگ سفر کررہے تھے۔ پٹنہ سے بیتیہ پھر پٹنہ پھر کولکتہ کا سفر درپیش رہا، سوتشنگی باقی رہ گئی جی تو چاہتا تھا کہ ان سے استفادہ مزید کرتے۔ بہرحال بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔

بہار اردو اکاڈمی کا دوروزہ پروگرام اکاڈمی کے وسیع وعریض ہال میں افتتاحی سانسیں لینے لگا، گورنر بہار نے اس دوروزہ کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ چراغ جلا اور پھر چراغ سے چراغ جلتا گیا۔مشہور زمانہ ''خدا بخش لائبریری" میں گزشتہ تین سالوں سے ڈائرکٹر کا عہدہ خالی ہے اور کوئی بھی اس سمت میں توجہ دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔ اردو اکیڈمی کے عالمی اردو کانفرنس میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے جب اس معاملہ کو اٹھایا تو بہار کے گورنر نے یقین دہانی کرائی کے یہ مسئلہ جلد ہی حل کردیا جائیگا۔ ہمارا مختصر قافلہ کتب خانے کی زیارت کے لئے گیا جس میں جاوید دانش، ندیم ماہر احمد اشفاق اور غالبا عتیق انظر بھی شامل تھے،ساتھیوں نے وفا یزدان کو جب اطلاع دی کہ ہم خدا بخش لائبریری دیکھنے جارہے ہیں تو معلوم ہوا محترمہ ہم سے پہلے زیارت کرآئی ہیں ماشاللہ یہ ہوتی ہے اہل علم ودانش کی کتابوں سے دلچسپی کہ ترجیحی بنیادوں میں ایسی بیش بہا دولتیں دیکھنے کومل جائیں۔کاش کہ نئی نسل بھی ان مکتبات کی اہمیت کو سمجھے ورنہ جو حال خدا بخش لائبریری کا دیکھا وہ اپنی عظمت رفتہ پر ماتم کرنے کے قابل تھی۔ کتب خانے کا عملہ پہلے تو کسی قسم کے تعاون سے گریز کرتا رہا جب انہیں پتہ چلا کہ ہم لوگ بیرونی ممالک سے آئے ہیں تب قدرے رعایت برتی گئی اور کچھ نمونے از راہ کرم دکھائے گئے۔ پھر کچھ نمونوں کی کاپیاں جو برائے فروخت تھیں احباب نے یک ایک نسخہ خریدلیا تاکہ سفر کی یادگار رہے۔

خدا بخش لائبریری کے قیام کو 100 سال سے زیادہ؟ عرصہ ہو چکا ہے کہتے ہیں اس کی کہانی مرحوم محمد بخش سے شروع ہوتی ہے جو خدا بخش کے والد تھے۔ انہوں نے اپنے ذاتی شوق کے تحت تقریباً 1400 مخطوطات حاصل کئے تھے اور مرتے وقت اپنے صاحبزادے خدا بخش کو سونپتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اسے ایک عوامی کتب خانہ کی شکل دیں اور مخطوطات کی تعداد میں اضافہ کریں۔ خدا بخش لائبریری جسے استنبول عوامی کتب خانہ (ترکی) کے بعد دنیا کے دوسرے بڑے کتب خانے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

خدا بخش خاں کی زندگی میں ہی یہ کتب خانہ اورینٹل لائبریری کے نام سے موسوم ہوا اور 14 جنوری 1891 کو خدا بخش نے باضابطہ وقف نامہ کے ذریعہ یہ کتب خانہ عوام کو وقف کر دیا۔سنہ 1969 میں حکومت نے اسے قومی اہمیت کا ادارہ قرار دیا۔

عملہ کی اطلاع کے بموجب اس لائبریری میں 21 ہزار سے زائد مخطوطات موجود ہیں جو عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، پشتو اور ترکی زبانوں میں ہیں۔ ان میں سے کئی تو ایسے ہیں کہ ان کا دوسرا نسخہ دنیا میں کہیں موجود نہیں خدا بخش لائبریری نادر مخطوطات کا بیش قیمت خزانہ ہے اگر اس پر بروقت توجہ نہ دی گئی تو یہ بھی اردو فارسی کے دیگر کتب خانوں کے انجام سے بچ نہیں سکتی۔

افتتاحی پروگرام کے بعد شام تک کوئی نہ کوئی سلسلہ چلتا رہا پٹنہ میں ۱۲ اور ۲۲ مارچ کو منعقدہ اس دوروزہ عالمی کانفرنس کا عنوان ''اردو زبان وادب ہند وبیرون ہند'' تھا سو حسب روایت آغاز کیلئے گورنر بہار جناب رام ناتھ کووند نے اس کانفرنس کی افتتاحی شمع کو روشن فرمایا کہ شمع جلانا ایک علامتی معاملہ بھی ہے اس طرح انعقاد کے مقاصد اور نتائج کے امکانات کو روشن کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ ریاست بہار کیوزیر انسانی بہبود محترم عبدالغفور بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ سید ارتضیٰ کریم بھی اردو کے عشق میں عزت سادات کو بچاتے بچاتے عظیم آباد کے اس عظیم پروگرام میں شریک تھے۔ تقریریں ہوئی حسب معمول اردو کے لئے محبتوں کا اظہار اور وعدے کئے گئے۔ افتتاحی تقریب کے ساتھ ہی تصویری کاروائیاں شروع ہوئیں مہمانوں اور میزبانوں کے ساتھ وزرا اور گورنر نے بھی عزت بخشی۔ پروگرام کو کیمروں اور ویڈیو کیمروں میں قید کیا جانے لگے۔ اس گھما گھمی میں میں اسٹیج پر کھڑا تھا کہ ایک معصوم چہرا میرے

سامنے آیا اور آٹوگراف کی فرمائش کرنے لگا۔ میرے لئے زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے آٹوگراف مانگی تھی۔ پڑھتے اور سنتے آے تھے جبکہ کوئی شاعر سے آٹوگراف مانگتا ہے تو ایک شعر لکھ کر دستخط کرنا ہوتا ہے۔ میں نے ایک شعر لکھا تاریخ لکھی اور اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ شہ نشین سے نیچے اترا تو پھر ایک نسوانی آواز آئی سر آٹوگراف!! اس بار لڑکی تھی جو قدرے سیانی اور شرمیلی بھی لگی۔ اسی مناسبت سے ایک خوبصورت شعر لکھ کر اس سے حال احوال پوچھے اس نے رابطہ رکھنے کی خواہش کرتے ہوئے فیس بک آئی ڈی دریافت کی اور اپنا فیس بک آئی ڈی بھی بتا دیا۔ شام کو داستان گوئی کا پروگرام تھا ایک طرف جاوید دانش اپنی تیاریوں میں لگے تھے تو دوسری سمت نوری صاحب داستان گوئی کے ماحول کے مطابق سامان کی خریداری کر رہے تھے۔ داستان گوئی بہت دلچسپ صنف تو ہے ہی مگر برادرم جاوید دانش نے اسے ایک نیا موڑ دیا تھا۔ وہی داستان جو دہلی کانفرنس کے دوران سنی تھی آج پھر اس کا انعقاد ہونے جا رہا تھا۔ داستان کے بیچ جاوید دانش نے شعری ملحقات شامل کر کے اسے مزید دلچسپ بنا دیا تھا۔ مثلاً ''میرا احسن مجھ سے پوچھتا ہے بابا کیا ابا بیلیں نہیں آئیں''، اور ایک نظم بھی جس میں پتھروں کی گردان کرتے ہوئے دانش نے در و دیوار پتھر کے اور چیزوں کو پتھراتے ہوئے ''رخسار پتھریلے'' تک کہہ دیا۔ جاوید دانش کی اک طائرانہ نظر اس پتھریلی۔۔۔ پر پڑی تھی جسے میں نے بھی تاڑ لیا تھا ساتھ ہی جاوید دانش کی چابک نظری کی بھی داد دینی پڑی۔ دوسرے دن سمینار منعقد ہوا مقالے پڑھے گئے محترمہ زرنگار نے بھی اپنا مضمون پیش کیا اور بیرون ہند خصوصا کنیڈا امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے انکی ثانوی حیثیت کا اظہار اپنے قیمتی مقالے میں کیا۔ جب جاوید دانش نے مائک سنبھالا تو زرنگار کے اس موقف کی زوردار مخالفت کی اور واضح کیا کہ ہماری حیثیت کنیڈا میں کسی کنیڈین سے کم ہرگز نہیں ہے

انہوں نے مزید کہا کہ خلیجی ریاستوں میں بعض جگہوں پر ایسا ہوسکتا ہے۔ زرنگار کا اپنا مطالعہ تھا اور جاوید دانش کا اپنا تجربہ سو معاملہ رفع دفع ہو گیا، رہی خلیجی ریاستوں کی بات تو یہاں کیا کیا ہوسکتا ہے اسے قلمبند کرنے یا کہنے کی ہمیں اجازت ہے نہ جرات اور نہ ہی ضرورت کہ ہم پکے مسلمان ہیں قضا و قدر پر ایمان رکھنے کے علاوہ، تابعداری ہماری فطرت ہے۔

شام پھر ایک محفل شعر سجی اور مہمانوں کے علاوہ میزبان شعرا نے بھی خوب خوب کلام سنایا۔ اردو اکیڈمی بہار کی جانب سے مہمانوں کو شرکت کا شہادت نامہ، آمد و رفت کے جملہ خرچ کے علاوہ کیسہ زر سے بھی نوازا گیا۔ نوری صاحب کے سارے انتظامات بہت معیاری رہے۔ رٹز ہوٹل جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا اردو اکیڈمی کے بالکل روبرو تھی صرف سڑک عبور کرنا ہی جملہ مسافت تھی۔ تیسری صبح بیتیہ کا پروگرام طے تھا بیتیہ پٹنہ سے تقریبا ۲۰۰ کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بیتیہ کوچ کرنے والوں میں خواتین نہیں تھیں کیونکہ خواتین کا علیحدہ مشاعرہ پٹنہ میں کسی اور تنظیم کی جانب سے منعقد ہو رہا تھا سو، وفا یزدان منش، محترمہ عذرا قیصر نقوی صدف اقبال اور سلمی شاہین نے ادھر کا رخ کیا۔

بیتیا کو روانگی، صبح حسب معمول رٹز ہوٹل میں ناشتہ کر کے ہمارا قافلہ باہر نکل آیا اس قافلہ میں بیرونی اور مقامی مندوبین کے علاوہ مشتاق احمد نوری سکرٹری اردو اکاڈمی بہار بھی ساتھ تھے، باہر آے تو دیکھا تقریبا تین عدد جیپیں مسافران شعر و ادب کے لئے تیار کھڑی تھیں حسب ترتیب سب سوار ہو گئے اور قافلہ چل پڑا۔ بیتیا بھی تاریخی حیثیت کا حامل شہر ہے جس کے ایم جے کے کالج بیتیا میں تقریب کا انعقاد ہونا تھا اور راستے میں مظفر پور پر پروفیسر ناز قادری کے دولت خانے قادری منزل پر حاضری بھی دینی تھی گنگا کا لمبا پل پار کر کے ہماری جیپ ایک بازار میں رک

گئی پتہ چلا صفدر امام قادری صاحب کی ایک تلمیذہ کو وہاں سے سوار ہونا ہےسو وہ ہماری ہی جیپ پر اپنے استاذ محترم کے بازو براجمان ہو گئیں جگہ کی تنگی تھی مگر صنف نازک کو اڈجیسٹ کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی وہ بھی صفدر امام کی شاگرد ہو تو کیا کہنے سو گردیزہ صاحبہ کو بٹھا لیا گیا۔ پتہ چلا کہ وہ کسی ہندو مذہب کی کتاب پر اردو میں کام کر رہی ہیں بہرحال تحقیق کا کام کرنے والے ویسے ہی سوکھ جاتے ہیں سو گردیزہ بھی شاخ گل ہونے کے باوجود سوکھی ٹہنی سی لگ رہی تھیں۔ جیپ یہاں سے چل پڑی تو مظفرپور پر ہی جا کر رکی مظفر پور میں پروفیسر ناز قادری کی ملاقات زندگی کا ایک اہم اثاثہ ہے جسے شائد تاعمر بھلا نہ سکوں۔ دوڈھائی گھنٹے ہی قیام رہا مگر بعض لمحے ایک عمر پر بھاری ہوتے ہیں۔ ناز قادری بزم صدف کے چیئرمین شہاب الدین احمد کے والد بزرگوار ہیں ان کی علمی و ادبی خدمات وتصنیفات سے ان کے دیوان خانے میں الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ جو بات یادگار ہوگئی وہ ان کے اظہار کی مجبوری اور اس کی کیفیات تھیں وہ فرما رہے تھے کہ ''میں آپ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں مگر کچھ کہہ نہیں پا رہا ہوں'' ان کے اظہار میں اسقدر مجبوری ان کی صحت کے عدم استحکام کے باعث تھی ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جب وہ یہ کہہ رہے تھے۔ ہمارے دل ان کی اس مجبوری سے بیٹھے جا رہے تھے اللہ انہیں جلد صحت وشفا سے نوازے آمین۔ ان کے ہاں ہی دوپہر کا کھانا لگایا گیا وہاں کے مقامی ایم ایل اے بھی ہمارے ساتھ شریک محفل تھے علاقے میں ناز قادری صاحب اور انکے خاندان کی بہت قدر و منزلت کا اندازہ مقامی اہم اشخاص کی آمد سے ہو رہا تھا۔ جناب ظفر امام قادری اور دیگر برادران صفدر امام قادری سے یہیں ملاقات ہوئی۔ ناز قادری کے گھر کا ہر فرد خلوص ومحبت کا پیکر نظر آئے تو اصل منبع کا کیا حال رہا ہوگا جو اس وقت اپنی علالت کے سبب اپنے جذبات واحساسات کے اظہار میں بھی مجبور ومعذور دکھائی دے رہا تھا مگر اس مجبوری کے پیچھے چھپے ہوے خلوص اور محبت کا سمندر اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا جسے ہر ذی احساس محسوس کرسکتا تھا۔

اشرفیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ کے اشتراک اور بہار اردو اکیڈمی کے تعاون سے یہ پروگرام بزم صدف انٹرنیشنل نے پوری آب وتاب سے منعقد کیا۔ اس اجلاس اور مشاعرے میں ایم جے کے کالج کے پرنسپل اور ہندی کے ادیب و شاعر پروفیسر نیرج کمار نے بھی بہت تپاک سے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی اور اردو سے یگانگت اور محبت کا اظہار کیا اور بہت محبتوں سے نوازا۔ پروفیسر ارتضی کریم نے افتتاح فرمایا اور بزم صدف کے چیئرمین شہاب الدین احمد نے استقبالیہ کلمات سے نوازا۔ مجلس صدارت میں نوری صاحب صفدر امام قادری جاوید دانش وغیرہ شامل تھے۔ یہ تجربہ اس سفر میں ہمارے لئے نیا نیا سا لگا کہ جہاں صرف صدارت ہونی چاہئے وہاں مجلس صدارت کا رواج دیکھنے میں آیا اور مہمانوں میں بھی اسقدر تنوع کے مہمان خصوصی مہمان ذی وقار مہمان ذی احتشام اور پتہ نہیں کیا کیا عنوان دیے جاتے ہیں اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ شریک ہونے والے سب اہم لوگ اپنے منصبوں کو پا کر خوش ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ہم نے حیدرآباد سے جدہ تک محفل کا ایک صدر اور ایک مہمان خصوصی ہی دیکھا تھا کبھی کبھی دو مہمان ہو جاتے ہیں مگر مجلس صدارت کا یہ نیا مشاہدہ جو دہلی سے بہار اور کولکتہ تک ہوتا رہا۔

سیمینار کا عنوان ''اشرف قادری کی ادبی خدمات'' چار یا پانچ مقالے پڑھے گئے سیر حاصل گفتگو ہوئی اور اشرف قادری کا مکمل تعارفی منظرنامہ ہمارے چشم تصور میں سما گیا۔ پھر جاوید دانش کی داستان گوئی نے رنگ بکھیرے تو فضاؤں میں قوس قزح کا منظر رونما ہونے لگا۔ بہرحال صبح سے رات دیر گئے تک شمع ہر رنگ میں جلتی رہی داستان کے بعد بین الاقوامی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جس میں مہمان شعرا اور مہمان شعرا کی اتنی بڑی تعداد کم ہی دیکھنے یا سننے کو

ملتی ہے، پھر بھی باذوق سامعین کی سماعتوں نے کہیں جھول نہ آنے دیا پوری توجہ انہماک سے سارا پروگرام اپنی آخری سانسوں تک چلتا رہا۔ رات دیر گئے ہم پھر بیتیا سے پٹنہ لوٹ رہے تھے بیتیا میں بھی ہوٹل کا انتظام کیا گیا تھا مگر ساتھی واپس لوٹنے کی خواہش کرتے رہے اسی لئے تمام گاڑیاں واپسی کے لئے تیار ہوگئیں۔

پٹنہ میں بزم صدف کا دوروزہ پروگرام: بیتیا سے عظیم آباد لوٹتے ہوئے اکثر ساتھی نیند میں تھے بلکہ ہماری گاڑی کا ڈرایور بھی اونگھ رہا تھا جسے جاوید دانش نے باتوں میں لگا کر نیند سے کوسوں دور پہنچا دیا تھا۔ راستے میں ایک آدھ مقام پر گاڑیاں روک کر چائے پی گئی اور بعض احباب خصوصاً زاھد الحق نے پان سے بھی لطف لیا۔ پٹنہ واپس آئے جہاں رٹز ہوٹل کے کمرے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا خواتین مشاعرے سے واپس آچکی ہیں۔ عذرا نقوی نے شاہد محمود کے وسیلہ ٹی وی کے لئے وفا یزدان منش کا انٹرویو لیا جسے شاہد محمود فلمارہے تھے۔

چوبیس مارچ دوہزار سترہ بروز جمعہ،عصر کے بعد ہی ہم لوگ پھر ایک بار اردو اکاڈمی بہار کے وسیع وعریض ہال میں جمع ہوگئے، ڈھلتے دن کی خوبصورت ساعتوں میں بزم صدف انٹرنیشنل کا دوروزہ پروگرام ''بین الاقوامی ادبی وتہذیبی جشن'' اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ افتتاحی مراحل میں داخل ہوا۔ تلاوت اور نعت شریف کا نذرانہ پیش کرنا ہمارے ادبی اور ثقافتی پروگراموں کی ابتدائی کاروئی میں شمولیت کی روایت عرصے دراز سے چلی آرہی ہے سو یہ رسم بھی پوری ہوئی، حالانکہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اس طرح ہم دیگر مذاہب کے لوگوں کو یہ باور کرواتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے، گوپی چند نارنگ چندر بھان خیال کو قران اور نعت شریف کی سماعت سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ قران دستور عمل ہے اور نعت رسول مقبول ﷺ سے محبت کے اظہار کا ایک خوبصورت پیرایہ۔ دین سے ہماری محبت مسلم ہے اس لئے اگر ان خیالات کے اظہار سے کسی دل کو برا لگے تو مجھے معذور سمجھیں کہ حقیقت یہی ہے۔

بزم صدف انٹرنیشل کے مجموعی کارناموں میں کتابوں کی اشاعت ایک اہم حیثیت رکھتی ہے کہ بزم صدف کتابوں کی اشاعت میں بڑی فراغ دل ہے سو اس کا اظہار ہونا تھا اسی لئے ابتدائی لمحات میں تقریباً دس تا بارہ کتابوں کی رسم اجرا یا رسم رونمائی ادا کی گئی کلیدی خطبات کے بعد ایک ایسا اعلان ہوا جس کا ہمیں گمان بھی نہیں تھا سو یوں ہوا کہ بزم صدف کی جانب سے دنیا بھی سے تین شخصیات کو مجموعی طور پر اردو تحریکی خدمات کے اعتراف میں قیمتی ایوارڈ پیش کئے جانے کا اعلان ہوا۔ اس میں قطر کے حسن عبدالکریم چوگلے، جدہ سے خاکسار مہتاب قدر، اور گیا بہار سے یوسف منظر کا نام شامل تھا۔ شال اور ایوارڈ سے پیش کرنے والوں میں اولین حیثیت سے بزم صدف کے چیئرمین برادرم شہاب الدین احمد اور بزم صدف کے ڈائرکٹر صفدر امام قادری کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم ریختہ کے مشیر پروفیسر انیس الرحمٰن اور ڈاکٹر زاہد الحق شامل تھے۔ اس اجلاس کی صدارت بھی ارتضی کریم فرما رہے تھے اور مہمانوں میں بہار اردو اکاڈمی کے سکرٹری مشتاق احمد نوری، وفا یزدان منش جاوید دانش واحد نظیر شہ نشین پر براجمان ہوئے۔ شہاب الدین احمد نے خیر مقدمی کلمات پر بزم صدف کے اہداف، ارادوں اور عزائم کا بھرپور جائزہ پیش کیا جس سے اندازہ ہوا کہ ان کے ارادے ایک وسیع پیمانے پر بین الاقوامی اردو ادارہ قائم کرنا ہے جس کے ذریعے نہ صرف معروف اردو کے خدمتگاروں کو منظر عام پر لانا ہے بلکہ غیر معروف شعرا وادبا کی تصنیفات کی اشاعت کے ذریعے عالم اردو سے انکی حیثیت منوانا بھی ہے۔ عجیب وغریب عزائم لئے شہاب الدین احمد اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے تھے، یقین نہیں آتا کہ ایک سیدھا سادہ سا انسان اپنے سینے میں اسقدر جوش وخروش رکھتا

ہے، پروگرام کی نظامت پروفیسر صفدر امام قادری نے چلائی۔ ڈراموں کی دنیا کے روشن ستارے جاوید دانش کا اثرانگیز ڈرامہ ''ایک تھی روحی'' ڈرامہ آرٹسٹ منوج مانو نے بہت خوبصورت انداز میں پیش کر کے ہال میں موجود تمام لوگوں کو دیر تک تالیاں بجانے پر مجبور کر دیا۔

مغرب کے بعد طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت مقامی استاد شاعر سلطان اختر نے فرمائی جو اردو اکاڈمی بہاری کے نائب صدر بھی ہیں اور انکی تصنیفات کو شرف اشاعت سے بزم صدف نے ہی نوازا ہے۔ طرحی مصرع ''کاسہ دل سے لہوں سے آنکھوں سے پانی لے گیا'' مجھے ہندوستان پہنچنے سے قبل ہی دیا گیا تھا، عموماً میں طرحی غزلیں کہنے سے اجتناب کرتا ہوں اگر یہاں بچنا محال تھا سو چند شعر کی ایک غزل پیش کی، جبکہ مہمان اور میزبان شعرا کی ایک لمبی قطار تھی جنہیں طرحی مشاعرہ پڑھنا تھا، ان میں خواتین بھی شامل تھی جیسے عذرا نقوی اور وفا یزدان منش افشاں بانو وغیرہ۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر واحد نظیر نے فرمای ءاور خاکسار کو مہمان خصوصی بننے کا شرف حاصل ہوا۔

دوسرے دن دو سمینار ہوے، ایک سرسید کی دانشورانہ جہت دوسو سالہ تقریبات کے موضوع پر تھا اور دوسرے اجلاس میں جدید غزل کی معتبر آواز کے عنوان سے سلطان اختر کی شاعری اور شخصیت پر مقالے پڑھے گئے۔ جاوید دانش کی داستان کے بعد پھر ایک ڈرامہ پیش کیا گیا۔ جاوید دانش کا ڈرامہ اختتام کو پہنچا تو مسکراتی آنکھوں والی طلعت پروین ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اسٹیج پر آئیں اور پھر جاوید دانش سے بات کرتے ہوے ان کے دونوں پیمانے چھلک گئے۔ وہ کہہ رہی تھیں اور آنسو رواں تھے کہ ''ڈرامے کے کردار نے جس طرح اپنے والد کہ کینسر کے درد سے گزرنے کا رول نبھایا میں اس منظر میں بلکل گم ہوگئی تھی کیونکہ میں نے اپنی والدہ مرحومہ کو اس درد اس کرب سے گزرتے دیکھا ہے بس وہ منظر لگا جیسے ہمارا اپنا ہے''، پروفیسر علیم اللہ حالی سے پٹنہ میں ملاقات ہوئی تو موصوف کی جدہ آمد کے واقعات اور انکی گفتگو اور شاعری یاد آ گئی۔ انہیں جب پتہ چلا کہ جدہ سے میں حاضر ہوا ہوں تو پروفیسر صاحب نے جدہ کے احباب کی خیریت پوچھی جس میں علیم خان فلکی کا خصوصیت سے ذکر فرمایا۔ جدہ میں ایک نجی محفل میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے موضوع پر فلکی صاحب نے پروفیسر حالی سے گفتگو فرمائی تھی، عموماً مجھے ایسے خشک موضوعات سے دلچسپی نہیں ہوتی سو میں خاموش پروفیسر علیم اللہ حالی کی گفتگو سنتا رہا جسے یاد رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی کہ شاعری اور نثری نگارشات ہی ہم موثر انداز میں پیش کرتے رہیں تو ہمارے لئے کافی ہے۔

عظیم آباد بہار کا وہ اہم شہر جہاں اردو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی شان دکھاتی ہے وہیں ایک تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ سرکاری زبان ہونے کے باوجود شہر کے کسی سائن بورڈ پر اردو نظر نہیں آئی اگر نظر آئی تو دوسری سطر میں گویا اس کی حیثیت ثانوی ہو۔ اردو اکاڈمی بہار کا اسٹیج جو دو مستطیل ٹیبلوں پر مشتمل ہے جسے جوڑ کر پورا اسٹیج بنایا جاتا ہے، جب پروگرام کی تیاریاں ہو رہی تھیں میں نے کام کرنے والوں سے کہا بھائی جس ٹیبل میں اردو اکاڈمی بہار اردو رسم الخط میں لکھا ہے اسے داہنی جانب کردو کیونکہ اردو داہنی جانب سے لکھی جاتی ہے اور جو متن ہندی میں لکھا ہے بائیں جانب کردو کہ ہندی بائیں جانب سے لکھی جاتی ہے اسطرح اردو کو اس کا جائز مقام تو مل سکتا ہے مگر انتظامیہ نے ہماری تجویز ماننے سے انکار کر دیا سو ہم اردو کی طرح چپ رہے کہ ہم بھی تو اپنے کو اردو والے سمجھتے ہیں۔ اگر نوری صاحب یا انکے قریبی ساتھی تک میری یہ تجویز پہنچے تو اس پر سرکاری وعدوں کی طرح ہمدردانہ غور فرمائیں۔

سلسلہ جاری

جانِ عالم کا پری خانہ اور ریڈیو پاکستان

پچھلے دنوں کرکٹ کے نام اور کھلاڑی جاوید میاں داد نے غصے میں آ کر کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا تو اس پر ایک ادب دوست نے ہم سے پوچھا، اس قسم کا غصہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو کیوں نہیں آتا۔ ہم نے عرض کیا، ہمارے ادیب اور شاعر اپنا سارا غصہ ادب پر ہی نکال لیتے ہیں اور خود اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ وہ کہنے لگے، صورت حال نہایت تشویش ناک ہے، ادیبوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن معیاری ادبی تخلیقات کا قحط ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ جو ادیب غیر معیاری تحریروں کے انبار لگا رہے ہیں، وہ ادب سے تائب ہو کر کوئی آبرو مندانہ پیشہ اختیار کریں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس طرح سرکاری ملازموں کو ناکارکردگی کی بنا پر جبری طور پر ریٹائر کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

اس کے جواب میں ہم نے عرض کیا، ادیب کسی کے ملازم تو ہوتے نہیں جو انھیں جبری طور پر ریٹائر کیا جا سکے۔ ادب ایک خود اختیاری شغل ہے اور خود کردہ را علاجے نیست۔ موصوف ہمارے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور کہنے لگے، کم از کم یہ تو ہو سکتا ہے جو ادیب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوں، وہ ساتھ ہی ادب سے بھی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیں۔ ہمارے اظہار تعجب پر انھوں نے اپنی بات کی وضاحت یوں کی عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بعض سرکاری ملازم جنھیں ادب سے دلچسپی ہوتی ہے، دوران ملازمت اس خوف سے کتابیں نہیں لکھتے کہ کہیں ان کے اس کام کو بھی ان کی ناقص کارکردگی میں شمار نہ کر لیا جائے، لہٰذا وہ ریٹائر ہوتے ہی کتابوں کے انبار لگا دیتے ہیں، اس سے انھیں تو شہرت ملتی ہے لیکن ادب کی شہرت خراب ہوتی ہے۔

ہمیں معلوم نہیں ہمارے ادب دوست کرم فرما کا اشارہ کن ادیبوں کی طرف ہے، لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، ہم کم از کم ایک ایسے ادیب کو جانتے ہیں جو سرکاری ملازمت کے دوران ہی نہیں، ریٹائر ہونے کے بعد بھی ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہمارا اشارہ جمیل زبیری کی طرف ہے جو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور غیر بنیادی طور پر بھی بہت کچھ لکھتے رہتے ہیں، یعنی ایسے کام کرتے ہیں جو ادب کی تخلیق سے زیادہ مفید ہیں۔ جیسے انھوں نے برٹرینڈ رسل کی شہرۂ آفاق کتاب Conquest of Happiness کا اردو ترجمہ ''دائمی مسرت کا حصول'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ کام ہے۔ ترجمہ ایسا سلیس اور رواں دواں ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کتاب اصلاً اردو میں لکھی گئی ہو اور بعد میں اسے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہو۔ اردو میں ایسی مفید کتابوں کو منتقل کرنا طبع زاد افسانے لکھنے اور شعر کہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس سے ہمارا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ جمیل زبیری کو طبع زاد افسانے لکھنے کی بجائے غیر ملکی زبانوں کے اچھے افسانوں کا ترجمہ کرنا چاہیے، انھیں دونوں کام کرنے چاہییں تاکہ انھیں معلوم ہوتا رہے کہ آج کے اردو افسانے کو عالمی افسانے کی سطح تک پہنچنے کے لیے کتنی صدیاں درکار ہوں گی۔

جمیل زبیری کا تازہ ترین کارنامہ ان کی کتاب ''یاد خزانہ'' ہے جس میں انھوں نے ریڈیو پاکستان سے اپنی وابستگی کے 25 برسوں کی یادوں کو بڑی خوش اسلوبی سے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ہم نے اسے دو مرتبہ پڑھا۔ پہلی مرتبہ یہ جاننے کے لیے کہ کتاب کیوں لکھی گئی ہے اور دوسری مرتبہ

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کس کے لیے لکھی گئی ہے۔ پہلے سوال کا جواب یہ ملا کہ ہر آدمی کی اپنے ماضی سے دلچسپی ہوتی ہے، اس لیے جب وہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے پاس صرف ماضی ہوتا ہے تو وہ اپنے زمانہ حال اور بچے کچھے مستقبل کو خوش گوار بنانے کے لیے ماضی کی یادوں سے دل بہلاتا ہے۔ جمیل زبیری نے اپنے گزرے ہوئے لمحوں کی خوش گوار یادوں سے اپنے حال و مستقبل کو خوش گوار بنانے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ملا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جنھیں یہ معلوم نہیں کہ راجہ اندرا اپنے اکھاڑے کے لیے اور جان عالم واجد علی شاہ اپنے پری خانے کے لیے خواہ مخواہ بدنام ہیں، ایسے کئی اکھاڑے اور کئی پری خانے تو ریڈیو پاکستان کے ایک گوشے میں سما سکتے ہیں۔

اس کتاب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں خواتین کا تذکرہ بڑی کثرت اور فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔ ہر دوسرے صفحے پر کوئی نہ کوئی خاتون جلوہ گر نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی ڈراما آرٹسٹ ''صدابہار'' نظر آرہی ہے اور کہیں کوئی گلوکارہ آواز کا جادو جگا رہی ہے۔ کہیں کوئی شاعرہ شاعری کا موضوع بنی ہوئی ہے اور کہیں کوئی افسانہ نگار حقیقتوں کو افسانہ بنا رہی ہے۔ ان سب کے بارے میں جمیل زبیری نے دلچسپ تفصیلات فراہم کی ہیں اور ان کے فن اور ناک نقشے پر فکر انگیز تبصرے بھی کیے ہیں۔ اس مناسبت سے کتاب کا نام ''یادخزانہ'' کی بجائے ''تذکرۃ الخواتین'' بھی ہو سکتا ہے کہ پرانے زمانے میں ایسی کتابیں ایسے ہی ناموں سے لکھی جاتی تھیں۔ ہم نے یہ بات اعتراضاً نہیں، جذبہ ممنونیت کے تحت کہی ہے کیوں کہ کتاب کے مطالعے سے پہلے کئی معروف ''خواتین'' کے بارے میں بہت سی غیر معروف تفصیلات کا ہمیں علم نہ تھا۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جناب مصنف کے ماضی کی یادیں، پڑھنے والوں کے مستقبل کو بھی خوش گوار بناتی رہیں گی۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس کتاب کے ہر دوسرے صفحے پر کسی خاتون کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ اسی طرح ہر تیسرے صفحے پر کسی نہ کسی شادی کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ کہیں شادی چوری چھپے ہو رہی ہے اور کہیں برسرِ عام کہیں مرد کسی عورت کو ورغلا کے اور کہیں عورت کسی مرد کو ''اغوا'' کر کے شادی کر رہی ہے۔ کہیں شادی کے خلاف فریقین کے بزرگ شور مچا رہے ہیں۔ کہیں کسی ریڈیائی شادی کی خوشی میں جناب مصنف اپنے دستِ مبارک سے مٹھائی تقسیم کر رہے ہیں۔ غرض کہ کتاب کیا ہے کسی نکاح خواں کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے، جس میں بے شمار نکاحوں کے کوائف درج ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ ریڈیو پاکستان ایک نشریاتی ادارہ ہے، اب معلوم ہوا کہ یہ اچھا خاصا میرج بیورو ہے۔

جمیل زبیری شادی بیاہ کے معاملات میں حتی المقدور دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی دلچسپ واقعات بھی لکھے ہیں۔ اس قسم کا ایک دلچسپ واقعہ سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ لکھتے ہیں ''میرے کمرے میں آئیں، چہرے پر پریشانی کے کچھ آثار تھے، میں نے جیسے ہی ان سے وجہ پوچھنے کی کوشش کی، وہ ایک دم رونے لگیں اور ان کے لمبے لمبے آنسو ان کے چہرے پر ڈھلکنے لگے۔ میں ایک دم پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ بھئی کیا بات ہوگئی۔ آخر آپ اس طرح کیوں رو رہی ہیں، نہ روئیں اور مجھے وجہ بتائیں۔ دفتر میں آپ کو اس طرح نہیں رونا چاہیے کوئی آئے گا تو کیا سمجھے گا۔ لوگوں کو میرے متعلق بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ پھر انھوں نے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھے اور کہنے لگیں: ''میں نے وہ جو ایک ڈاکٹر آتے ہیں، ان سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے''۔

اس واقعے کی جان یہ جملہ ہے کہ ''لوگوں کو میرے متعلق بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے''۔ اس پر ہم تبصرہ نہیں کریں گے، البتہ

اس پر تعجب ضرور کریں گے کہ اکثر خواتین جناب مصنف کے پاس آتے ہی رونے لگتی تھیں۔ مذکورہ خاتون تو اس لیے روئی تھیں کہ وہ شادی کے لیے پریشان تھیں، ایک اور خاتون کے رونے کا سبب شادی میں ناکامی تھا۔ ان کا قصہ بھی سن لیجیے، ''ایک روز ایک خاتون میرے پاس آئیں، سخت پریشان چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئیں میں نے پوچھا، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ ہمدردی کے یہ دو بول سن کر رونے لگیں اور لمبے لمبے آنسوان کے گالوں پر بہنے لگے۔ میں ایک دم پریشان ہوگیا۔ میں نے ان سے کہا آپ روئیں نہیں اور مجھے بتائیں کہ کیا بات ہے۔ پھر انھوں نے اپنا پورا حال بتایا کہ کس طرح ان کے شوہر نے انھیں طلاق دے کر گھر سے نکال دیا''۔

مذکورہ دونوں واقعات میں خواتین کے لمبے لمبے آنسو ایک ہی انداز سے بہے، البتہ جمیل زبیری کی پریشانی کا اظہار قدرے مختلف انداز سے ہوا۔ پہلے واقعے میں وہ پریشانی میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے، مگر دوسرے واقعے میں وہ کرسی پر بیٹھے رہے۔ خیر یہ جملہ تو معترضہ تھا جو بات کہنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ موصوف کے پاس ضرور کوئی باطنی کمال ہوگا جس کی وجہ سے وہ خواتین کے مسائل حل کر دیتے تھے، ورنہ کوئی خاتون شادی کے لیے یا طلاق حاصل کرنے کے فوراً بعد کسی وکیل کی بجائے ریڈیو پاکستان کے ایک افسر کے پاس کیوں جاتی!

ریڈیو پاکستان میں کیسے کیسے لوگ ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک اسٹیشن ڈائریکٹر کھانے پینے کے اتنے شوقین تھے کہ وہ بیشتر وقت کھانے میں اور موقع مل جائے تو پینے میں صرف کرتے تھے۔ عملے کے ساتھ میٹنگ کے دوران سکھوں کے لطیفے سنایا کرتے تھے اور جو وقت بچ جاتا تھا، اس میں دوسروں کی برائیاں کیا کرتے تھے۔ ایک افسر نے بڑی مزاحیہ طبیعت پائی تھی لیکن ان کے مزاح کا معیار بقول مصنف یہ تھا ''ایک مرتبہ ایک ڈراما آرٹسٹ ان کے کمرے میں بیٹھی تھی، میں بھی اتفاق سے وہاں کسی کام سے گیا، میرے سامنے ہی انھوں نے اپنے موزے اتارے اور اس کی ناک کے سامنے لے جا کر زور زور سے ہنسے اور کہنے لگے ''لو سونگھو'' جس ادارے میں اس ذہنی سطح کے لوگ کام کرتے ہوں، وہاں جمیل زبیری جیسے شائستہ اور نستعلیق انسان کا 25 برس گزار لینا بڑی ہمت کی بات ہے۔

اس کتاب کا خاصا بڑا حصہ ادیبوں کے بارے میں ہے۔ ریڈیو کے ملازم ادیبوں کا ذکر تو برمحل ہے کہ کتاب ریڈیو کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور ایسے ادیبوں میں سے بعض کے بارے میں نادر معلومات ملتی ہیں۔ مثلاً بعض اخبارات میں سیاسی مضامین لکھنے پر سلیم احمد مرحوم سے جواب طلبی کی گئی تو جمیل زبیری کو انکوائری آفیسر مقرر کیا گیا۔ اس واقعے کی جو تفصیل جمیل زبیری نے بیان کی ہے وہ سلیم احمد کے سوانح نگار کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن عام ادیبوں شاعروں کے تذکرے سے کتاب کو گراں بار کرنے کی بلا وجہ کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے یہ طریق کار اختیار کیا ہے کہ پہلے شاعر یا شاعرہ سے اپنی سرسری ملاقات کا ذکر کیا ہے، پھر اس کے کلام پر رائے دی ہے، آخر میں دو چار شعروں کی صورت میں نمونہ کلام پیش کر دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کلام پر جو رائے دی ہے وہ متعلقہ شاعر کے مجموعہ کلام کے فلیپ سے نقل کر لی ہے۔ اقتباس واوین میں ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ رائے کس کی ہے۔ ان سب باتوں کا ریڈیو سے کوئی تعلق ہے نہ مصنف کی یادداشتوں سے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کام کی بھی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے۔ کراچی کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں اگر کوئی پچاس سال بعد تحقیق کرنا چاہے گا تو یہ کتاب اس کی بڑی مدد کرے گی۔ محقق کو بہت سے ادیبوں شاعروں کے نام اس کتاب کے علاوہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آئیں گی۔

جمیل زبیری چوں کہ افسانہ نگار ہیں، اس لیے انھوں

نے بعض افراد کا ذکر کرتے ہوئے ادب تخلیق کیا ہے۔ مثلاً ایک خاتون کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں ''مجھے وہ دیگر فن کاروں سے مختلف نظر آئیں۔ وہ ایک خوش شکل، خوش لباس اور خوش وضع خاتون ہیں، ان کی آنکھوں میں سیاہی کے علاوہ گہرائی بھی ہے، چہرے کے نقوش بردباری سے مل کر بتاتے ہیں جیسے انھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے''۔

جمیل زبیری آنکھوں کی سیاہی اور گہرائی کو خوب سمجھتے ہیں، اس لیے انھوں نے جا بجا آنکھوں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔ مثلاً ''عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں نظر آ رہی تھیں، اسے دیکھ کر پہلی بات جو ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ اس کے چہرے پر اس کی عینک کا فریم کچھ زیادہ ہی بڑا تھا''۔ اب ایک شاعرہ کی آنکھوں کا قصیدہ بھی سن لیجئے ''خوابوں کی شاعرہ ہیں، وہ اپنی جاگتی اور سوتی آنکھوں سے خوابوں کے جتنے ذائقے چکھتی ہیں پہلے ان کا بین السطور اظہار کرتی ہیں، مگر اب ان ذائقوں کو بلا کم و کاست الفاظ کے گجرے پہنا کر اپنے قاری کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ ان کی پلکوں کی منڈیر پر دیکھے اور ان دیکھے خوابوں کی قطاریں جلتی ہیں تو ان سے ہفت رنگ کرنیں پھوٹتی ہیں اور انھی کرنوں کا عکس جب ان کی شاعری پر پڑتا ہے تو دھنک کے سارے رنگ مجسم ہو کر الفاظ کی بانھوں میں سمٹ آتے ہیں''۔

واضح رہے کہ پلکوں کی منڈیر پر خوابوں کے دیئے جلانے والی ان شاعرہ کا ریڈیو پاکستان سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا، اس کے باوجود وہ ریڈیو سے متعلق 25 سالہ یادوں کا حصہ بن گئیں۔ معلوم نہیں یہ شاعرہ کا کمال ہے یا مصنف کا۔ بہر حال مصنف کے اس کمال کا اعتراف تو کرنا ہی پڑے گا کہ انھوں نے ایک شاعرہ کی تعریف شاعری ہی کی زبان میں کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اچھی نثر ہی نہیں، اچھی نثری نظم لکھنے پر بھی قادر ہیں۔

(5 / مئی ۱۹۹۴ء)

بیگ احساس

کے

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

اشتیاق سعید

افسانہ

بعید از قیاس

خلافِ معمول آج گیارہ بجے آنکھ کھلی، میں چونک کر بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دیوار پر آویزاں گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے انگڑائی لی پھر کسلمندی زائل کرنے کی خاطر دو تین منٹ تک ہلکی پھلکی ورزش کرتا رہا، جب قدرے راحت محسوس کی تو بیڈ روم سے نکل کر ہال کی جانب بڑھ گیا۔ ہال میں بیگم کو کسی خاتون سے محوِ گفتگو دیکھ اُلٹے پاؤں بیڈ روم میں لوٹ آیا۔ تکیہ کے نیچے سے سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر اُٹھایا، ڈبیہ سے سگریٹ برآمد کیا اور ہونٹوں کے درمیان پھنسا کر آگ دِکھا دی۔ دو طویل کش کھینچنے کے بعد ٹوائلٹ کی جانب بڑھ گیا۔ حوائجِ ضروریہ سے فراغت، برش، شیونگ اور غُسل۔۔۔ اِن تمام مراحل سے گزرنے میں غالبًا گھنٹہ بھر کا وقفہ صرف ہو چُکا تھا۔ باوجود اس کے بیگم ہنوز اُس خاتون کی گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ پھر کیا تھا غُصّہ آہستہ آہستہ ناک کی جانب سفر کرنے لگا۔ اس سے پیشتر کہ غصّہ پوری طرح ناک پر براجمان ہوتا میں بے دھڑک ہال میں داخل ہو گیا۔ خلافِ توقع مجھے اس طرح کسی خاتون کی موجودگی کے باوجود ہال میں دیکھ کے پہلے تو بیگم چونکیں پھر سنبھل کے خاتون کی جانب اشارہ کرتی ہوئی بولیں۔

''آپ ہیں ہماری نئی پڑوسن''۔

خاتون فوراً لکھنوی انداز میں سر جھکا کے آداب بجالاتے ہوئے انتہائی مہذّب لہجہ میں گویا ہوئی۔

''ناچیز کو تسکین صدیقی کہتے ہیں''۔

خاتون کا خالص لکھنوی انداز اور طرزِ گفتار نے میری حسِّ مزاح کو بیدار کر دیا تھا، لہٰذا میں نے بھی فوراً سے پیشتر کہا۔

''اور اِس ہاں چیز کو الیاس صفی کہتے ہیں''۔

میرے اس مزاحیہ طرزِ تخاطب پر بیگم اور تسکین صدیقی دونوں ایک ساتھ کھلکھلا پڑیں۔

☆

تسکین صدیقی چالیس کے پیٹے میں تھی، لیکن رکھ رکھاؤ اور خوش بدنی کے سبب تیس سے زائد کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بعد میں بیگم نے مجھے اُس کی تفصیل بتائی کہ ''تسکین کا میکہ جونپور کے محلّہ تاڑ تلہ کا ہے اور سسُرال الہ آباد کے محلّہ دریا آباد کی۔ اپنے پڑوس والے فلیٹ میں رہنے کے لیے آئی ہے۔ خود ہے اور اس کی ایک بارہ تیرہ برس کی بیٹی شائستہ ہے۔ گزشتہ برس بڑی بیٹی ثنا کا بیاہ کر دیا ہے۔ داماد بالی ووڈ میں کچھ کرتا ہے اور شوہر خلیج میں بن لادن کنسٹرکشن کمپنی میں فورمین ہے۔ دو برس پر محض پینتالیس دِنوں کی چھٹّی پر آتا ہے، اور۔۔۔''۔

''پھر دو برس کے لیے تنہا تڑپنے کے لیے چھوڑ جاتا ہے''۔

بیگم کا جملہ مکمل ہوتا اس سے قبل ہی لاشعوری طور پر یہ جملہ میری زبان سے پھسل پڑا۔ بیگم مجھے استعجابیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ میں قدرے خفیف ہوتا ہوا بولا۔

''بھئی، ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ میں نے کوئی ایسی ویسی بات تو کہی نہیں ہے''۔

''میں حیران ہوں کہ آپ نے یہ بات کب اور کیسے سُن لی''۔

بیگم کا لہجہ استعجابیہ تھا۔

''تو کیا یہ بات تسکین نے تم سے کہی تھی؟''۔

''ہاں! وہ اپنے شوہر سے اسی بات کی تو شاکی

ہے۔ بائیس برس ہوچکے ہیں اُس کے بیاہ کو،لیکن تب سے اب تک وہ جی بھر کے شوہر کو اِنجوائے نہیں کرسکی ہے۔ حالانکہ اس کا برمِلا اظہار اپنے شوہر سے بھی کرتی رہی ہے ،مگر اُس نے اسے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا''۔بیگم کے لہجہ میں کرب کا شائبہ تھا۔

''تردّد کی کوئی بات نہیں بیگم،محض تسکین ہی نہیں یہ ہر اُس عورت کا المیہ ہے جس کا شوہر خلیج میں ملازمت کرتا ہے''۔

☆

دوسرے روز شام کے وقت جب میں گھر پہنچا تو دیکھا تسکین صوفے پر براجمان ہے، مجھے دیکھتے ہی ،تعظیماً اُٹھ کھڑی ہوئی اورحسبِ دستور فرشی سلام کیا،پھرخوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

''آپ ہی کی منتظر تھی''۔

''بھئی خیریت تو ہے؟''۔

میں اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے صوفے پر دراز ہوگیا۔

''دراصل، میں آپ کی گفتگو سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی''۔

''معاف کرنا محترمہ،میری گفتگو سے آپ کی سمع خراشی ہوگی''۔

کہتے ہوئے اُٹھا اور بیڈروم میں داخل ہوگیا۔ بعد میں افسوس بھی ہوا کہ مجھے اس طرح کی غیر اخلاقی حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی۔

☆

چار پانچ روز بعد جھُٹ پٹے کے وقت تسکین مجھے رِکشا اسٹینڈ کی جانب سے آتی دِکھائی پڑی۔اُسے دیکھتے ہی میں نے فوراً اپنا رُخ موڑلیا۔ باوجود اس کے اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا اور لپک جھپک میرے قریب آن پہنچی۔

''ایسی بھی کیا بے رُخی کہ سلام تک نہ پہنچے۔۔۔الیاس صاحب!ہماری صورت اتنی بھی بُری نہیں کہ کراہیت سے مُنہ پھیر لیا جائے''۔

''معاف کرنا میں نے آپ کو دیکھا نہیں''۔

میں نے دروغ گوئی کا سہارا لیا۔

''بھئی معافی تو اب اسی شرط پر مِل سکتی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ کسی مناسب ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ایک پیالی چائے نوش کریں''۔

وہ اپنی کجراری آنکھوں کو نچاتی،اٹھلاتی ہوئی بولی۔

''محترمہ یہ شرط کسی اور دِن پر اُٹھا رکھیں تو بہتر ہے،فی الحال میرا چائے سے شغل کا قطعی موڈ نہیں ہے''۔

میں نے بھی اُسی کے لہجے میں جواب دیا۔وہ سُن کر ہنس پڑی اور استعجابیہ لہجہ میں گویا ہوئی۔

''کیا کہا! چائے سے شغل کا موڈ نہیں؟ ارے جناب موڈ بنانے کے لیے ہی تو چائے سے شغل فرمایا جاتا ہے''۔

''جی ۔۔۔لیکن سورج غروب ہونے سے پیشتر ۔۔۔۔۔اب تو سورج رات کے سیاہ آنچل میں مُنہ چھپا کر سو بھی چُکا ہے۔

'' صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو ہمارے ساتھ کہیں بیٹھنے میں تردّد ہے''۔

وہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں نہیں ۔۔ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔دراصل میرا سورج چائے کی پیالی میں نہیں ساغر ومینا میں غروب ہوتا ہے''۔

''اوہ آئی سی''۔

وہ لبوں کو دائرہ نُما سِکوڑ کر ،ابروؤں کو مخصوص انداز سے اُچکاتے ہوئے معنی خیز لہجہ میں بولی۔

''یعنی کہ۔۔۔یعنی کہ آپ ۔۔۔دُخترِ انگور کے ساتھ ۔۔۔۔آں؟''۔

''جی۔۔۔''۔

میں کچھ خجل سا ہوا تھا۔

''تو چلو چائے نہ سہی وائے ہی سہی، ایسے میں آپ کے ساتھ نسبتاً زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع میسّر آئے گا''۔

اور وہ خوشی سے جھومتے ہوئے گنگنانے لگی۔

''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو''۔

اُس کی یہ سرشاری دیکھ کر میں چونک کر پوچھا۔

''آپ بھی۔۔۔۔۔؟''۔

''کبھی کبھار۔۔۔جی کچھ زیادہ ہی بوجھل ہو جاتا ہے تب!۔۔۔ویسے اگر آپ کو اعتراض ہو تو۔۔۔۔''۔

''نہیں نہیں۔۔۔بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے!''۔

☆

یوں تو میں اکثر سانتا کروز کے 'رادھیکا' بیئر بار میں بیٹھا کرتا تھا، لیکن تسکین کے ساتھ وہاں جانا مجھے کچھ مناسب نہ لگا اور میں اُسے یاری روڈ، اندھیری کے ''مدھوبن'' بار اینڈ ریسٹورنٹ میں لے جانے کا تہیہ کیا۔ کیونکہ وہاں بہت سی خواتین، بالخصوص کارپوریٹ سیکٹر میں ملازمت کرنے والیاں نیز فلموں کی اسٹرگلرس اداکارائیں غم غلط کرنے آیا کرتی تھیں، شاید اسی سبب وہاں کا ماحول نسبتاً دوسری جگہوں سے کافی پُرسکون ہوتا تھا۔ مدھم روشنی اور ائیرکنڈیشنر کی خنکی میں ہلکی ہلکی کلاسیکی موسیقی۔۔۔گلاسوں اور بوتلوں کی کھنکھناہٹ کے ساتھ ساتھ خواتین کی نقرئی قہقہے ماحول کو مزید خوشگوار بناتے تھے۔

بہرکیف! ہم نے سانتا کروز سے یاری روڈ تک کا سفر آٹو رِکشا میں طے کیا۔ اس دوران وہ ایک آن کو بھی خاموش نہ رہی تھی، اپنی اور اپنے شوہر کے درمیان تعلقات کی نوعیت، کالج کے دنوں کے معاشقے اور اپنی زندگی کے وہ تمام سربستہ راز جو ایک عورت کسی عورت پر بھی منکشف کرنے میں تامّل کرتی، وہ بے جھجک مجھ سے شیئر کر رہی تھی۔ حتیٰ کہ اُس نے یہ تک کہہ دیا کہ اُسے اپنی بیٹی ثنا کی خوشگوار ازدواجی زندگی سے انتہائی رشک ہوتا ہے، کیونکہ اُسے ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر مِلا ہے۔ ثنا دن بھر چاہے جہاں رہے، لیکن رات میں اُس کا شوہر اُسے پل بھر کو بھی خود سے جُدا کرنے کا روادار نہیں ہوتا۔

☆

'مدھوبن' پہنچنے میں تقریباً چالیس منٹ صرف ہوئے۔ ریسٹورنٹ کے باہری حصّے میں تمام میزیں بھری تھیں، اندرائے۔سی ہال میں دو میزوں کے علاوہ تمام میزیں خالی پڑیں تھیں۔ ہم نے گوشے والی میز کا انتخاب کیا اور آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی بیرا آ گیا اور میز پر اوندھے رکھے ہوئے گلاسوں کو سیدھا کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا لینگے سر؟''۔

میں نے اپنا مخصوص برانڈ رائل اسٹیگ کا آرڈر دیا اور تسکین نے وہائٹ مِس چیف منگوائی۔ کھانے کے لیے پہاڑی کباب، اور چکن کریسپی کا آرڈر دیا گیا۔ بیرا جب آرڈر لے کر چلا گیا تو میں نے برائے گفتگو اُس سے دریافت کیا۔

''تسکین! کیا تمھارے شوہرِ نامدار بھی اِس آبِ تلخ کے رسیا ہیں؟''۔

''نا۔۔۔قطعی نہیں۔۔۔وہ تو پنج وقتہ نمازی، متقی اور پرہیزگار ہیں، اُنھیں کمپنی کی جانب سے ہر سال عمرہ کی سعادت بھی نصیب ہوتی ہے''۔

''اچھا!''۔

میری زبان سے کلمۂ تاسُف نکلا۔

''جی!۔۔۔وہ جب چھٹیوں میں آتے ہیں تو، رات کا بیشتر حصّہ تہجد کی ادائیگی اور وظائف میں گُزارتے ہیں''۔

''پھر آپ کے ساتھ۔۔۔۔؟''۔

''نہیں۔۔۔مجھے اُن کا ساتھ بالکل نصیب نہیں

ہوتا''۔

''کیا!''

''جی''۔

''لیکن۔۔لیکن کیوں!''۔

''شاید اُنھیں یہ علم ہی نہیں کہ وظیفہٗ زوجیت بھی عبادت میں شامل ہے اور یہی وہ عبادت ہے، جو آدمی پوری یکسوئی اور تندہی سے انجام دیتا ہے، یہی عبادت، آدمی کو آدمی بناتی ہے اور بندے کو خدا سے قریب کرتی ہے''۔

اس اثنا میں بیرا شراب اور دیگر لوازمات لے کر آ گیا اور انھیں سلیقے سے میز پر چُننے لگا۔ بیرے کی موجودگی میں وہ خاموش رہی۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد شہادت والی اُنگلی اور انگوٹھے کی مدد سے کانوں کی لوؤں کو پکڑ کر اوپر کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''پروردگار تُو ہی معاف کرنے والا ہے''۔

بیرا جب ہمارے پیگ بنا کر چلا گیا تو اُس نے میرا گلاس میری جانب بڑھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''یہ رہا آپ کا رائل اسٹیگ، یعنی شاہی ہرن۔۔اِس کے اندر جاتے ہی آپ کا دِل ہرن کی طرح قلانچیں بھرنے لگے گا۔۔ممکن ہے کسی ہرنی کی تمنّا بھی کر بیٹھے''۔

''اوہ۔۔۔ایسی بات ہے تو آپ بھی رائل اسٹیگ ہی لیں تا کہ میرا اور آپ کا دِل ساتھ ساتھ ہرن اور ہرنی کی طرح قلانچیں بھریں اور ایک دوسرے کی تمنا کریں''۔

میں شرارتاً اپنا پیگ اُس کے لبوں سے لگانے لگا تھا۔لیکن اُس نے ہاتھ بڑھا کر روک دیا اور ہنستے ہوئے بولی۔

''رائل اسٹیگ آپ ہی کو مبارک، مجھے تو اپنی وہائٹ مِس چیف یعنی سفید شرارت عزیز ہے۔البتہ آپ سفید شرارت کے موڈ میں ہوں تو میرے ساتھ شیئر کر سکتے ہیں، میں ہمہ تن تیار ہوں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن، اس سے کیا حاصل؟''۔

''ارے جناب! نام سے یہ سفید ضرور ہے۔۔دراصل ہے تو لال پری! یہ جب اندر اُترتی ہے نا تو پتھر سے پتھر دِل انسان کی شرارت، چاہے وہ شرافت کے ملبے تلے ہی کیوں نا دبی ہو، باہر نکل آتی ہے''۔

وہ دیدوں کو نچاتے ہوئے قدرے شوخی سے بولی۔

''آپ جیسی حُسن سے لبریز اور زندہ دِل پری سامنے ہو تو پتھر بھی یقیناً شرارت پر آمادہ ہو جائے گا۔۔۔خیر، میں تو انسان ہوں''۔

میں نے اُس کے گداز جسم کو اپنی نگاہوں کی حِصار میں قید کرتے ہوئے شہوت آمیز لہجے میں کہا۔وہ اس پر کوئی توجہ دیے بغیر اپنا جام اُٹھاتے ہوئے چہکتے لہجے میں بولی۔

''آج کی شام میری تشنگی اور آپ کی سیرابی کے نام۔۔۔چیئرس''۔

پھر جام سے جام ٹکرائے۔۔۔لب رہ رہ کے جام کو بوسے دینے لگے اور جام تشنگی کو آسودہ کرنے کی کوشش!۔۔۔۔۔وہ جس قدر چسکیاں لیتی، بجائے تشنگی آسودہ ہونے کے بڑھتی ہی جاتی۔علاوہ ازیں اُس کے اندرون کی گرہیں بھی ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔

☆

ہم ایک ایک کواٹر پی چُکے تھے، مجھ پر نشہ طاری ہو چلا تھا، تسکین کی بھی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔لہٰذا میں نے بیرے کو بل دینے کے لیے اشارہ کیا، لیکن اُس نے مجھے سختی سے روک دیا اور مزید ایک ایک کواٹر لے آنے کا حُکم دے دیا، اور مخمور نگاہوں سے میرا سراپا نہارتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

''الیاس صاحب، میں عورت ہو کر مردانگی کا مظاہرہ کر رہی ہوں اور آپ مرد ہو کر بھی، جناب ابھی تو ٹھیک سے حلق بھی

تر نہیں ہوا اور آپ ہیں کہ۔۔''

اتنا سُنتے ہی میرے اندر کا مرد بے قابو ہو گیا۔

'' آپ کا حلق تر نہیں ہوا ۔۔۔مطلب ،تشنگی باقی ہے؟''۔

میرا لہجہ سوالیہ تھا۔اسی اثنا میں بیرا ہم دونوں کے برانڈ لا کر رکھ گیا تھا۔تسکین اپنی بوتل اُٹھا کر ڈھکن کھولتے ہوئے بولی۔

''اجی جناب ۔۔۔تشنگی باقی ہی نہیں ۔۔۔ بلکہ میرے وجود کا حِصّہ بن چُکی ہے''۔

''ایسی بات ہے تو آپ کی تشنگی کو سیراب کرنا اب میرا فرضِ اوّلین ہے۔کیونکہ میکدے کے عقیدے کے مطابق یہاں تشنہ کام رہنے والا شریعتِ غالبؔ کا مُنکر تصور کیا جاتا ہے''۔

میں نے اپنی بوتل اُٹھا کر اُس کی پُشت کو ہتھیلی پر ٹھوکتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا، میں شریعتِ غالبؔ کی قطعی قائل نہیں ،البتّہ مینا کماری کی شریعت پر ایمان ضرور رکھتی ہوں''۔

وہ گلاس میں شراب ڈھالتے ہوئے تپاک سے بولی۔

'' دونوں میں کوئی فرق نہیں، دونوں ہی اپنے اپنے وقتوں کے بلانوش تھے''۔

میں آئس بکس سے برف کا ٹکڑا نکال کر گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

'' کیوں نہیں ہے فرق ۔۔۔فرق ہے، وہ بھی معمولی نہیں۔۔۔زمین آسمان کا فرق !۔۔۔غالبؔ،اپنے ذوق کی تسکین کی خاطر بلانوش ٹھہرائے گئے تھے، جبکہ مینا کماری اپنے بطون میں دہکنے والی آگ کو کسی حد تک سرد کرنے کی خاطر بلانوش مشہور ہوئیں''۔

اُس کی آواز میں ایک قسم کا استقلال در آیا تھا۔

''اوہ ۔۔۔ یوں معلوم ہوتا ہے مینا کماری کے بطون میں دہکنے والی آگ آہستہ آہستہ آپ کے اندر سرایت کر رہی ہے!''۔

'' میرے اندر آگ نہیں ،لاوا بہہ رہا ہے،لاوا ! میں اپنے ضبط کے حِصار سے اس لاوے کو روکے ہوئے ہوں، ورنہ یہ ،میرے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنے وجود کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتا ہے''۔

کہتے ہوئے اُس نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔میں حیرت واستعجاب کا پیکر بنا اُس کا یہ روپ دیکھ رہا تھا۔اُس نے اپنے گلاس میں مزید شراب ڈھالنے کے لیے بوتل اُٹھائی اور گلاس پر قدرے جھکاتے ہوئے بولی۔

''الیاس صاحب دیکھئے،گلاس کو بھرنے کے لیے بوتل کو گلاس پر جُھکنا پڑتا ہے ۔۔۔یوں سمجھ لیجئے ، یہاں مرد، بوتل ہے اور گلاس عورت !''۔

''کیا!''میں چونک پڑا۔

''چونکئے مت،مرد اور عورت کے مابین رشتے کی یہی حقیقت ہے۔۔۔۔بوتل لبریز رہے اور گلاس خالی،تو بتایئے گلاس کے وجود کا کیا مطلب؟''۔

میں یکلخت اُس کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور اُس کی آنکھوں کے گلشن میں، جہاں شہوت کے بیشمار بھنورے بھنبھنا رہے تھے اپنی نگاہیں پیوست کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے بوتل لے کے ٹیبل پر ایک طرف کو رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو یہ بوتل اگر گلاس سے بے حسی یا بے تو جہی برتتی ہے تو گلاس کو بلا تامّل اِس بوتل سے استفادہ کرنا چاہئے''۔

کہتے ہوئے اُسکے گلاس کو اپنی بوتل کے قریب سرکا لیا۔یہ دیکھ کر اُس کے لبوں پر ایک ہیجان انگیز مسکراہٹ پھیل گئی،پھر اُس نے اضطراری کیفیت میں کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے اپنی دائیں ران کو بائیں ران پر چڑھالی، دونوں کہنیوں کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے میری جانب جھک آئی اور سرگوشیانہ لیکن مستحکم لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا یہ بوتل گلاس کو رازداری کی ضمانت دے سکتی ہے؟''۔

''یہ تو بوتل کے ظرف پر منحصر ہے''۔

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن جھینپ کر بغلیں جھانکنے لگا تھا۔ وہ میری اس حرکت سے لطف اندوز ہوتی ،ترچھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی پوچھی۔

''تو لگے ہاتھ یہ بھی بتا دیجئے کہ ظرف کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہے؟''۔

''اعتماد''۔

بے ساختہ میرے لبوں سے پھسلا۔اسی کے ساتھ میں نے ایک طویل چُسکی لی اور شراب کی کڑواہٹ کو پہاڑی کباب سے زائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔اُس نے بھی چکن کریسپی کا ایک قتلہ اُٹھایا اور اُسے ٹومیٹو ساس میں ڈبوتے ہوئی قدرے رسان سے بولی۔

''جہاں تک میں سمجھتی ہوں کہ اعتماد کچّے گھڑے کے مانند ہوتا ہے۔جو ظرف کے پُرشور اور تلاطم خیز دریا کا مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا''۔

''لیکن اس حقیقت کو بھی تو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ محبت نے سوہنی کو اسی کچّے گھڑے کے توسط سے عشق کا تلاطم خیز دریا پار کروایا تھا''۔

میں نے داستانوں کے حوالے سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔یہ سُن کر اُس نے کرسی کی پُشت سے ٹیک لگالی،جبکہ اُس کی گردن داہنی جانب ڈھلکی ہوئی تھی اور وہ خمار آلود نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی، قدرے توقف کے بعد کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔۔۔ریسٹورنٹ میں موجود غالبًا سبھی لوگ اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔میں خجل سا ہوگیا اور اُس کی جانب جھک کر استعجابیہ لیکن قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔

''تسکین، کیا ہوگیا۔۔کیوں ہنس رہی ہو؟''۔

وہ بدستور ہنستے ہوئے بولی۔

''میں تصوّر میں سوہنی کو کچّے گھڑے پر دریا پار کرتے دیکھ رہی تھی، اس پر یقین کرنے کو جی تو نہیں چاہتا، لیکن آپ کہتے ہیں تو مانے لیتی ہوں''۔

اسی دوران بیرا بل لے کر آگیا اور انتہائی مودبانہ لہجے میں گویا ہوا۔

''سوری سر۔۔۔بار کے بند ہونے کا ٹائم ہوگیا ہے''۔

یہ سُنتے ہی تسکین چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔

''کیا ! ۔۔۔بار کے بند ہونے کا ٹائم ہوگیا!!۔۔۔یار! ابھی تو ہم آپس میں کھُلے بھی نہیں اور بار کے بند ہونے کا ٹائم ہوگیا۔۔۔۔یہ تو سراسر زیادتی ہے۔۔۔کم از کم ایک ایک پیگ تو اور پلاؤ''۔

اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

''سوری میم۔۔۔اب بس! آپ کو زیادہ ہوگئی ہے''۔

بیرے نے شائستگی سے کہا۔

''یار، کہاں زیادہ ہوگئی ہے، الیاس صاحب بولیے نا آپ! ابھی تو نہ پیاس بجھی، نہ اندر کی آگ۔۔۔اور یہ کہتا ہے کہ مجھے زیادہ ہوگئی ہے''۔

کہتے ہوئے میرا بازو پکڑ کر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔میں اُسے سہارا دے کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''اب چلو۔۔۔بس ہوگیا''۔

''بس ہو گیا!۔۔۔لیکن، میری پیاس ۔۔۔بھی ۔۔نہیں بجھی۔۔اور اندر کی آگ۔۔۔بھی''۔

کہتے ہوئے اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں جبکہ میں نے پہلے ہی سہارے کے لیے پُشت سے اپنا ہاتھ اُس کی کمر پر رکھ چھوڑا تھا۔پھر اُسے سنبھالا دیتے ہوئے کسی طرح بار سے باہر لے

آیا۔ باہر آنے کے بعد ایک بار پھر حسرت و یاس بھرے لہجے میں بولی۔

''الیاس صاحب، میری۔۔ پیاس۔۔ بجھی نہیں''۔

میں قدرے جھنجھلا کر بولا۔

''چلو تو۔۔۔ تمھاری پیاس بھی بجھ جائیگی اور آگ بھی''۔

''کیا!''۔

وہ ٹھٹھک کر رُک گئی اور اپنی گردن کو پیچھے کرتے ہوئے میری جانب دیکھتے ہوئے غالباً تحکمانہ لہجہ میں پوچھی۔

''کون۔۔۔ بجھائے گا؟''

''میں۔۔۔ میں بجھاؤں گا''۔

کہکر اُسے تقریباً کھینچتے ہوئے اُس جانب آگے بڑھا جہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔۔۔ ٹیکسی کے قریب پہنچ کر وہ ٹھہر گئی اور میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے سر پہ دھرتے ہوئے التجائیہ لہجے میں بولی۔

''میرے۔۔ سر کی۔۔ قسم کھا کر کہو۔۔۔ آپ، میری پیاس۔۔۔ ضرور بجھاؤ گے''۔

'' ہاں بابا۔۔ ہاں !تمھاری پیاس ضرور بجھاؤں گا۔۔۔ پہلے ٹیکسی میں بیٹھو تو''۔

میرے لہجے میں جھنجھلاہٹ در آئی تھی۔

☆

ہم ٹیکسی میں سوار تو ہو گئے، لیکن پھر ہوش نہیں رہا کہ گھر کب اور کیسے پہنچے تھے۔۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں اپنے بیڈ روم میں تھا۔ چونک کر پہلے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اُٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو معلوم ہوا کہ دِن چڑھ آیا ہے۔ رات کی کثرتِ مہ نوشی کے سبب طبیعت میں اب تک کسلمندی تھی۔ سر بھی کچھ بھاری بھاری سا لگ رہا تھا۔ اس کے سبب باہر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن جانا بھی ضروری تھا کیونکہ شام پانچ بجے ایک پروڈیوسر سے میٹنگ تھی۔

لہذا چاروناچار ٹوائلیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ٹوائلیٹ میں داخل ہوتے ہی اچانک تسکین کا خیال آ گیا کہ وہ کیسے اپنے اپارٹمنٹ میں گئی ہوگی، کسی نے ہمیں رات گئے ساتھ میں دیکھا تو نہیں ۔۔۔ یا یہ کہ اُس نے میرے ساتھ بئیر بار میں بیٹھ کر مئے نوشی کی ہے، کہیں بیگم کے گوش گذار نہ کر دے!۔۔۔ خیر! جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو موسل سے کیا ڈرنا۔ اس مثل کے مصداق میں نے سارا معاملہ حالات پر چھوڑ دیا۔

☆

حیرت کی بات تو یہ کہ دِن میں دو یا تین مرتبہ میرے گھر میں آنے والی وہ خاتون پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی دِکھائی نہ دی۔ میرے گھر ہی میں نہیں بلکہ آتے جاتے سڑک پر حتیٰ کہ بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں بھی نہیں۔۔۔ پھر دھیرے دھیرے دو تین ہفتے مزید گزر گئے، لیکن اُس کی ایک جھلک تک کہیں نہ مِلی۔ آخر ایک روز اُس کے متعلق، میں نے دبے لفظوں میں بیگم سے استفسار کیا۔، بجائے اُس کے تعلق سے کچھ بتانے کہ بیگم نے ناگواری سے کہا۔

''چھوڑیئے بھی اُسے، وہ اب ہمارے یہاں نہ آئے تو ہی بہتر ہے''۔

''کیا!''۔

بیگم کے اس جملے سے میرا دِل دھک سے ہو گیا اور چھٹی حِس فوراً بیدار ہو گئی۔

''کہیں اُس رات بیگم نے مجھے تسکین کے ساتھ دیکھ تو نہیں لیا تھا''۔

اس خیال کے آتے ہی جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی تاہم اس پر قابو پاتے ہوئے میں نے بیگم کو مزید کُریدا۔

''ایسا کیوں کہتی ہو بیگم۔۔۔ تم دونوں نے تو آپس میں دوپٹے تبدیل کر کے بہنا پا کر لیا تھا؟''۔

''جی!۔۔۔سوتو ہے،لیکن کیا کروں وہ کم بخت،کان بہت کھاتی ہے''۔

''ہاں!میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔۔۔ویسے بیگم مجھےتو وہ جونپور کی بجائے کانپور کی معلوم ہوتی ہے''۔

''وہ کیوں؟''۔

بیگم نے چونک کر استفسار کیا۔

''وہ اس لیے کہ کان تو،کانپور والے ہی کھاتے ہیں''۔

بیگم کی جانب کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے قدرے بے نیازی سے بولا۔

''اور جونپور والے؟''۔

''وہ لوگ تو جان کھاتے ہیں''۔

یہ سُنتے ہی بیگم تُنک کر پیر پٹختی کچن میں داخل ہوگئیں۔میں بھی کلّی طور سے مطمئن ہوگیا کہ اللہ کا شُکر ہے تسکین نے بیگم سے کوئی بات نہیں بتائی ہے۔

☆

پھر رفتہ رفتہ تسکین کا تصوّر بھی میرے ذہن سے زائل ہوتا گیا۔قریباً دو مہینے بعد اچانک ایک رات دو بجے خلافِ توقع میرے موبائل کا بزر بجا،میں ٹیلی ویژن پر کوئی دلچسپ پروگرام دیکھ رہا تھا۔چونک کر موبائل اُٹھایا کہ اتنی رات گئے کس کا فون ہوسکتا ہے۔اسکرین پر دیکھا تو تسکین صدیقی کا نام فلیش ہورہا تھا۔میں نے فوراً کال ریسیو کیا۔سامنے سے تسکین کی سُریلی آواز سُنائی دی۔

''الیاس صاحب آداب۔۔۔اس وقت آپ کو ایک زحمت دینا چاہتی ہوں۔بشرطیکہ رازداری کا وعدہ کریں''۔

''جی بلاتکلف حُکم کریں بندہ اللہ کو حاضر اور ناظر جان کر سراپا رازدار رہنے کا وعدہ کرتا ہے''۔

میں نے قدرے شوخی سے کہا۔

''مجھے پورا اعتماد تھا کہ آپ کا جواب کچھ اسی نوعیت کا ہوگا۔۔۔خیر۔۔۔جس قدر بھی جلدی ممکن ہو،آپ گورے گاؤں پولیس اسٹیشن آجائیں''۔

''خیریت تو''۔

پولیس اسٹیشن کا نام سُنتے ہی میرے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے''۔

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''ارے کچھ بتائیں گی بھی کہ معاملہ کیا ہے؟''

میں جز بز ہوکر بولا۔

''آپ آجایئے بس۔۔۔سارا معاملہ خود بخود آپ پر منکشف ہوجائے گا''۔

اُس نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور گفتگو کا سلسلہ منقطع کردیا۔

☆

میں جب گورے گاؤں پولیس اسٹیشن پہنچا تو وہ ایک گوشے میں غم و یاس کا پیکر بنی بیٹھی تھی۔پاس ہی ایک سب انسپکٹر کاغذات کی خانہ پوری کرنے میں مشغول تھا۔مجھے دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور انسپکٹر سے بولی۔

''لو وہ آگئے''۔

انسپکٹر مجھے بہ غور اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میڈم کا۔۔آپ ہسبنڈ ہے؟''۔

میں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا چنانچہ بوکھلا کر بولا۔

''ہاں!لیکن ہوا کیا ہے۔۔۔آپ انہیں یہاں کیوں لے آئے ہیں؟''۔

''میڈم کو سروج گیسٹ ہاؤس سے اریسٹ کیا ہے''۔

''لیکن کیوں۔۔۔کیا گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا گناہ ہے؟''۔

''نہیں ساب، ایسا بات نہیں ہے۔وہ گیسٹ ہاؤس میں دھندہ ہوتا ہے۔۔۔ہم نے آج اُدر ریڈ کیا۔۔۔روم میں میڈم کے ساتھ کوئی تو بھی آدمی تھا وہ کھڑکی سے اُڑی مار کر بھاگ گیا۔۔اس کے واسطے میڈم کو اریسٹ کیا۔۔۔''۔

'' کیا آپ کو یہ اُس طرح کی عورت معلوم ہوتی ہیں؟''۔

مدھم لیکن، رعب دار آواز میں پوچھا۔

''نہیں نہیں۔۔آپ کا بولنا برابر ہے، پن کیا ہے نا، ہم نے میڈم کو روم سے اریسٹ کیا کر کے۔۔۔چلو ابھی آپ آگیا تو کچھ ہرکت نہیں۔۔۔نہیں آیا رہتا تو کل کورٹ میں حاضر کرنا پڑتا۔۔۔''۔

''تھینک یو۔۔۔تھینک یو سر۔۔۔''۔

کہتے ہوئے ایک پانچ سو کی نوٹ مروڑ کر اُس کے ہاتھ میں دبا دیا۔ نوٹ پاتے ہی انسپکٹر سراپا سپاس بن گیا۔اور تسکین کی طرف دیکھ کر بولا۔

'' میڈم آپ کو تپلیک (تکلیف) دیا، اسکے لیے سوری''۔

میں اُس کی بات پر توجہ دیے بغیر جھٹ تسکین کی کلائی پکڑ کر کھینچتے ہوئے پولیس اسٹیشن سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی اُس نے میری دونوں بانہیں تھام لی اور تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

'' آج آپ نے مجھے بہت بڑی رُسوائی سے بچالیا، ورنہ میں کسی کو مُنہ دِکھانے کے قابل نہ رہتی''۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔۔لیکن یہ بتاؤ، تمھیں گیسٹ ہاؤس کی ضرورت کیونکر آن پڑی؟''۔

میں جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

''جسم کی تشنگی اور اندر کی دہکتی آگ کھینچ لے گئی''۔

وہ نظریں چُراتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''الیاس صاحب میں بہت ہی بدنصیب عورت ہوں۔۔ اتنی بدنصیب کہ مجھے آسودگی اب تک نصیب نہیں ہوئی۔۔۔۔میں نے جسم کی تشنگی اور اندر کی آگ بجھانے کی خاطر جانے کیا کیا جتن کیے۔۔۔کہاں کہاں نہ گئی۔۔۔لیکن تشنہ کامی ہی ہاتھ آئی۔۔۔۔۔میں باآبرو رہنے کی شرط پر آبرو باختہ ہونا چاہتی تھی، اس لیے ہر ایک سے رازداری کی ضمانت کی خواہاں تھی۔۔۔غالباً یہی سبب ہے جو مجھے کسی پر اعتماد نہ ہوا، دِل نے بس ایک آپ کو قابلِ اعتنا جانا، لیکن افسوس! آپ نے بھی مجھ پر توجہ نہ کی''۔

'' یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔لیکن۔۔۔لیکن وہ کون تھا، جو تمھیں اس مصیبت کی گھڑی میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا؟''۔

''وہ کون تھا، یہ تو نہیں جانتی، البتہ میں کون ہوں، یہ ضرور جان گئی ہوں''۔

'' چلو یہی سہی۔۔۔بتاؤ، کون ہو تم؟''۔ میں نے طنزاً کہا۔

''میں۔۔۔میں ایک لُٹارن ہوں''۔

مجھے غرّاتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''وہ بھی ایسی کم ظرف اور بدذات لُٹارن، جسے لوٹنے کے لیے جب کوئی اور نہ مِلا، تو۔۔۔تو اپنی ہی بیٹی کے حق پر ڈاکہ ڈال بیٹھی''۔

سب رس

میں صرف **غیر مطبوعہ** مضامین اور تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

افسانہ

علی نثار

نجات

نیپال کے ایک دور افتادہ ہمالیہ کے دامن میں بسے چھوٹے سے گاؤں میں سالانہ تیوہار ہونے والا تھا ۔صبح سے موسم بہت سہانا ہو رہا تھا۔ ہمالیہ کی برفیلی چوٹی سورج کی شعاؤں سے سنہری ہوکر دمک رہی تھی ۔ٹھنڈی ہوائیں ماحول کو فرحت بخش بنا رہی تھیں۔ وہ صبح سے ہی وہ تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ ڈانس کی تیاری میں مشغول تھی۔ وہ تیوہار کی تیاری میں برھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ اس نے ایک شاندار ڈانس کے پروگرام کا بھی انتظام کیا تھا جس میں وہ خود پرفارم کرنے والی تھی۔ اس کی ایک تنظیم تھی جس سے وہ گاؤں کی فلاح کے لئے کام کرتی تھی تنظیم نے اعلی انتظامات کئے تھے دن میں پورے گاؤں کے لوگوں کی شاندار ضیافت کی تھی۔ اور سبھی کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا۔ ہر زبان پر اسکا نام تھا اسکی تعریف تھی۔ ہر لڑکی اس کی طرح بننا چاہتی تھی وہ ایک سال میں ہی اپنے گاؤں کے لئے رول ماڈل بن تھی۔ شام ہوتے ہی گاؤں میں قمقمے جلنے لگے اور آتش بازیاں چھوٹنے لگیں۔ ہر بچہ بوڑھا بے انتہا خوش تھا ایسا خوبصورت تیوہار تو انہوں نے کبھی نہیں منایا تھا۔

پہلے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں نے گاؤں کا روپتی ڈانش پیش کیا پھر عورت اور مردوں نے مل کر مقامی گانے گائے اور ڈانس کیا۔ اس کے بعد وہ اسٹیج پر چڑھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ اسکے سر پر ایک بڑا سا تھال تھا جو سرخ رنگ کے مخمل کے کپڑے سے ڈھنکا تھا اس نے وہ تھال دھیرے سے اسٹیج پر رکھا اور لوگوں سے مخاطب ہوئی۔

''میں ڈانس کرنے سے پہلے آپکو ایک نیپالی لڑکی کی کہانی سنانا چاہتی ہوں'' اس کی بات پہ زور سے تالیاں بج اٹھیں اس نے گلا کھنکار کر مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ تو سنیئے برسوں پہلے اسی گاؤں میں ایک معصوم سی الڑھ سی لڑکی انہیں کھیتوں میں ڈوڑتی بھاگتی تھی۔ بھیڑیں چراتی تھی اور ماں سے سوئٹر بننا سیکھتی تھی ۔گھر میں بہت غربت تھی ۔لڑکی کا خاندان جاڑے کے موسم میں بارڈر کراس کر کے ہندوستان کے ریاست صوبہ بہار میں جاتا تین ماہ گرم کپڑوں کی تجارت کرتا اور اسی پیسے سے سال بھر تک کھینچ تان کر خرچ چلانے کی کوشش کرتا۔ لڑکی کا ایک چچا ممبئی میں کام کرتا تھا اس بار جب وہ آیا تو اسنے لڑکی کو بغور دیکھا اور اسکے باپ کو کہا کہ اگر وہ اسکی بیٹی کو اسکے ساتھ ممبئی بھیج دے تو وہ اسے ایک بڑے بیوٹی پارلر میں بہترین تنخواہ پر نوکری لگوا دے گا۔ ان کی غربت دور ہو جائے گی۔

ریل کی رفتار کے ساتھ اسکا گاؤں تیزی سے پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔ وہ گم سم سی ریل کی کھڑکی سے چہرہ سٹائے بھاگتے ہوئے نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کی زمین ہلکی گیلی تھی۔ گاؤں کھیت کھلیان سکھیاں سب پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا ۔بس ایک چاچا تھا جو ساتھ بیٹھا تھا اور ہر تھوڑی دیر پہ کھڑکی میں منہ سٹا کر منہ میں بھری پیک باہر تھوک رہا تھا۔

''پتہ نہیں ممبئی کیسا شہر ہے۔ چاچا نے کہا ہے کہ مجھے بیوٹی پارلر میں اچھی سی نوکری دلا دے گا۔ میں بابا کو ہر مہینے پیسے بھیجوں گی ۔ ہماری غریبی دور ہو جائے گی ۔ بابا کو بہار جا کر گرم کپڑے کی پھیری نہیں لگانے دوں گی''۔ وہ دل ہی دل میں مختلف باتیں سوچ رہی تھی۔

جب وہ ممبئی میں ریل سے اتری تو لوگوں کا اژدہام دیکھ کر گھبرا گئی۔ چاچے کا ہاتھ اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔ چاچا اسے

ایک آٹو پہ بٹھا کر مختلف گلیوں سے گھماتا ہوا ایک تنگ سیڑھیوں کے اوپر بوسیدہ سے کمرے میں چھوڑ آیا۔اس نے دیکھا چاچانے ایک موٹی سی خرانٹ عورت سے نوٹوں کی ایک گڈی لے کر جلدی سے جیب میں رکھا اوراس کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے سیڑھی اتر گیا۔

عورت اس کی طرف بڑھی سر سے پیر تک جائزہ لیا

''ہوں۔مال اچھا ہے''اس نے خود کلامی کی اور دیوار میں ٹنگے بدرنگ سے آئینے میں اپنا جوڑا ٹھیک کرنے لگی۔اسے اچانک وحشت نے دبوچ لیا۔

کیا آپ کا ہی بیوٹی پارلر ہے جہاں مجھے نوکری کرنی ہے

۔

''کل لے چلوں گی پارلر کام سمجھانے جلدی کیا ہے'' وہ مسکرائی اوراسے بغور دیکھتی ہوئی اسکے سامنے کھانا لاکر رکھا۔اسے کھانا حلق میں اٹکتا محسوس ہوا۔

دوسرے دن وہ عورت اسے شہر کے ایک بڑے بیوٹی پارلر مین لے گئی وہ اتنے بڑے بیوٹی پارلر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔کئی جوان لڑکے لڑکیاں مشین کی مانند خاموشی سے ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ عورت اسے لے کر ایک آفس نما کمرے میں داخل ہوئی وہاں رنگ برنگے رنگ میں رنگے ہوئے بالوں والی ادھیڑ عمر عورت اور ایک بڑے پیٹ اور چمکیلی چندیا والا مرد بیٹھا تھا انہوں نے اسے بغور دیکھا

''ابھی کچی ہے'' مرد رنگین بالوں والی عورت کی طرف منہ کر کے بولا

اسے لے کر آنے والی عورت مودب کھڑی تھی ۔

''کیا دام ہے'' ۔ رنگین بالوں والی عورت بولی ۔

''دو پیٹی میں خریدا ہے۔ڈھائی دے دیجئے۔ ہمارا بھی تو پیٹ چلنا چاہیئے''۔

''بہت زیادہ ہے۔ہم دیڑھ دے سکتے ہیں۔اسے ٹرینڈ کرنے میں وقت لگے گا اور خرچ بھی ہوگا اس پر ۔''

''نہیں پڑتا ہے اپن کو''۔عورت بولی اوراسکا ہاتھ تھام کر کمرے سے نکلنے لگی۔

''رکو دو لے لو۔'' مرد بولا اوراسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔وہ شیشوں میں سجی مختلف لوشن اور کریم کے ڈبے کو دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی کہ یہ کس طرح استعمال کیا جاتا ہے ۔

پھراسے شہر سے باہر ایک خوبصورت بنگلے نما گھر میں پہنچا دیا گیا ۔ جس کے گیٹ پہ دو بڑے ایشین کتے کے ساتھ ایک پہرے دار ہمہ وقت تعینات رہتا۔ بنگلے میں اسے دو اور لڑکیاں بھی نظر آئیں جو بہت سہمی ہوئی تھیں۔اسے ایک آرام دہ کمرہ مل گیا۔

ایک دو دن تو وہ آرام سے رہی کھانا اسکے کمرے میں ہی آجاتا۔صفائی والی آکر صفائی کر جاتی اسے اس دن کے بعد وہ دونوں لڑکیاں نظر نہیں آئیں بلکہ ان کی جگہ ایک دو نئے چہرے اور نظر آئے۔مگر اسے اپنے کمرے تک ہی محدود رہنے کا حکم تھا تو وہ نئی نوکری جانے کے خوف سے کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی ۔

دو دن کے بعد اس کے کمرے میں ایک الٹرا ماڈرن عورت آئی ۔ جس نے بہت ہی مختصر سا لباس پہنا ہوا تھا۔کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر وہ اس سے اس کے گاؤں کی بات پوچھنے لگی۔ وہ بہت شوق سے اسے گاؤں کے بارے میں بتانے لگی ۔

''میرا گاؤں بہت سندر ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں بسا ہوا۔ہمالیہ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے سینہ تانے ہماری حفاظت پہ مامور ہو۔آپ نیپال گئی ہو دیدی۔کاٹھمنڈو بہت سندر شہر ہے۔میں ایک بار تیوہار میں کاٹھمنڈو گئی تھی میں نے بہت اچھا ڈانس کیا تھا مجھے انعام بھی ملا تھا''۔

''ہاں نیپال واقعی خوبصورت جگہ ہے،نو ڈاؤٹ''۔

وہ اپنے ملک کی تعریف سن کر خوشی سے مسکرانے لگی ۔

''آج سے میں تمہارے ساتھ تمہارے ہی کمرے میں رہوں گی۔''

''ارے واہ دیدی یہ تو بہت اچھا ہوگا''۔ وہ خوش ہوگئی ۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اس عورت نے تقریباً خود کو بےلباس کرلیا۔ جسم پر صرف دو ٹکڑے رہنے دئے پھر اپنے پرس سے ایک سی ڈی نکالی اور سی ڈی پلیئر میں ڈال کر ٹی وی آن کر دیا۔ وہ اسکرین پر ابھرنے والے متحرک سایوں کو دیکھ کر نگاہیں جھکا کر سرخ چہرے کے ساتھ بیٹھی رہ گئی ۔ وہ عورت آرام سے اوندھے لیٹی سایوں کو دیکھتی رہی ۔ پھر اچانک اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اسکے ہاتھ اسکے جسم کے نشیب وفراز میں الجھنےلگیں ۔ وہ ڈر کر بدک کر پیچھے ہٹی تو اسنے ایک زناٹے دار تھپڑ اسے مارا وہ بری طرح سہم گئی ۔

''میں تمہاری ٹرینر ہوں اور جیسے کہوں کرو'' اس نے غرا کر کہا اور ایک عورت ہی ایک عورت کو نوچنے میں مشغول ہوگئی ۔

یہ روز کیروٹین بن گئی تھی وہ عورت روز دو گھنٹے اسکے ساتھ گزارتی ۔مختلف فلم لگا کر اسے دکھاتی اور پھر اسے اسی عمل سے گزارا جاتا۔ شروع میں وہ شدید ذہنی دھچکے سے گزری تھی ۔مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ ایک ماہ پورا ہونے کے بعد اسکے ہاتھوں میں موٹی رقم تنخواہ کے نام پر تھمائی گئی ۔ رقم دیکھ کر اس کے زخم مندمل ہونے لگے۔

پھر جب اس عورت نے یہ اعلان کیا کہ لڑکی پوری طرح ٹرینڈ ہوگئی ہے تو اسے سرخ آنکھوں اور نم ہونٹوں والے ایک مرد کے ساتھ پندرہ دن کے لئے دبئی بھیجا گیا ۔ دبئی میں ایک بوڑھے شیخ کی تفریح کا سامان بن کر جب وہ لوٹی تو اس کا بیگ مختلف تحائف زیور اور پیسوں سے بھرا ہوا تھا ۔ممبئی میں بھی اسے بڑے بڑے بنگلوں میں بہترین لباس پہنا کر اور مہنگا میک اپ کر کے مہنگی گاڑی میں کسی الٹرا ماڈرن میم کی طرح پارٹیوں میں بھیجا جاتا جہاں وہ ڈانس کرتی تھی ۔اسے شہر میں اور ملک سے باہر بھی بھیجا جاتا ۔ ایک وہ ہی نہیں خوبصورت اور جوان لڑکیوں کی پوری کھیپ تھی ۔ جولڑکیاں اس دھندے میں پوری طرح ایڈجسٹ ہو جاتی انہیں ایک باڈی گارڈ کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے کی آزادی دی جاتی ۔اس نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تا اور اسے اب گاہکوں سے اپنے ناز و انداز دکھا کر ایکسٹرا پیسے اینٹھنے کا گر بھی آ گیا تھا۔

ہفتہ میں دو دن وہ پارلر جاتی جہاں وہ مردوں کا مساج کرتی تھی مساج کے ساتھ وہ انہیں جسمانی تسکین بھی پہنچاتی تھی ۔

اسے اس کیمالکن نے کہا کہ وہ اگر زیادہ پیسہ کمانا چاہتی ہے پورن ایکٹنگ بھی کرسکتی ہے ۔اس سے پیسے کے ساتھ مہنگے گاہک بھی ملتے ہیں ۔اس نے کچھ دن سوچا اور اپنی رضامندی دے دی۔

ایک نوجوان پروفیشنل فوٹوگرافر نے اسکی بہت خوبصورت تصاویر اتاری اور پھر تصویر منظر عام پر آتے ہی وہ راتوں رات پورن انڈسٹری کی اسٹار بن گئی ۔ پارلر کی مالکن کے ساتھ اس پر بھی پیسوں کی بارش ہونے لگی ۔ ایک رات کی قیمت لاکھوں میں طئے ہوتی ۔ وہ ہر ماہ پابندی سے ایک خطیر رقم اپنے والد کو بھیج دیتی ۔

وقت گزرنے کے ساتھ اسکا جسم بھی ڈھلنے لگا تھا ۔اب اسکی بکنگ کم ہی ہوتی اور اسے نئی لڑکیوں کو ٹرینڈ کرنے کے کام پر لگا دیا گیا تھا۔ وہ اپنا سارا پیسہ بینک میں ایک خاص مقصد کے لئے جمع کرتی رہی تھی اب اس مقصد کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے اپنے رٹائرمنٹ کا اعلان کیا اور نیپال واپس چلی گئی ۔گاؤں میں اتنے برسوں کے بعد کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ ہاں اسکا گھر پختہ ضرور ہو

گیا تھا۔ بابا مر چکا تھا اور ماں بھائی کے بال بچوں کے ساتھ آرام سے رہ رہی تھی۔ اسے اس کے گھر والوں اور گاؤں کے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ اس کے جانے کے بعد گاؤں کی کئی لڑکیاں ممبئی لے جائی گئیں۔ کچھ لڑکیاں بقول گاؤں والوں کے اچھی جاب پر لگ گئی ہیں اور پیسے باقاعدگی سے بھیجتی ہیں اور کچھ لڑکیوں کا پتہ نہیں انہیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

وہ چچا سے بھی ملنے گئی چچا بوڑھا ہو چکا تھا مگر اسے دیکھ کر بیغیرتی سے مسکرایا۔ اور بولا کہ اگر وہ اسے ممبئی لے جا کر وہ جاب نہ دلاتا تو آج وہ اس مقام پر نہ ہوتی۔ اس کے حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی اور وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

اس نیا نے والد کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اپنی تمام دولت ٹرسٹ کے نام کر دی۔ ایک اسکول قائم کیا اس میں گاؤں کی لڑکیوں کی تعلیم کا بہترین انتظام کیا۔ اب اسکی خواہش ہے کہ اسکے کاؤں کی ہر لڑکی تعلیم یافتہ ہو سماج میں اپنا مقام بنائے اور اسکی طرح جسم فروشی کے دل دل نہ ڈوبے۔

اس نے نیپالی لڑکی کی جسم فروشی کی دلگداز کہانی سنائی تو ہر آنکھ اشک بار ہو گئی۔ کہانی سنانے کے بعد اس کے قدم تال پر تھرکنے لگے۔ اسکی ایک ایک تھرکن ماحول کی اداسی کو بڑھا رہی تھی۔ وہ ناچ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسوں بہہ رہے تھے۔ مجمع سوگوار سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ ناچتے ناچتے اسنے سامنے پڑے تھال سے کپڑا ہٹایا اور کسی شئے کو مٹھی میں پکڑ کر سرعت سے مجمع کے سامنے کیا۔ ہر کسی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے چچا کا کٹا ہوا سر اسکے ہاتھوں میں تھا۔

ooo

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

شاعری

غزلیں

کوثر صدیقی

آدمی آدمی کا دشمن ہے
شہر بن مانسوں کا اک بن ہے

منتشر ہو رہے ہیں سب کنبے
بھائیوں بھائیوں میں ان بن ہے

ایک حمام میں ہیں سب ننگے
داغ آلودہ سب کا دامن ہے

آپ کو کون اب یہ سمجھائے
جیسا چہرہ ہے ویسا درپن ہے

رام جی کی اجودھیا ہے کہاں
اب تو لنکا ہے اور راون ہے

کورے مٹکے نہ سوندھا وہ پانی
کچی اینٹوں کے گھر نہ آنگن ہے

ہے قلندر صفت مگر کوثرؔ
شیشہ دل ایک مردِ آہن ہے

احسن رضوی

ایک نہ ایک خواب دیکھتے رہنا
خشک دریا میں پیرتے رہنا
کوئی شاید لگے نشانے پر
تیر ہواؤں میں پھینکتے رہنا
ان دنوں دوستوں کا شیوہ ہے
میرا ماضی کریدتے رہنا
خشک ہونے نہ پائیں یہ آنکھیں
ان میں آنسو تیرتے رہنا
گاہے گاہے زبان کو اپنی
خشک ہونٹوں پہ پھیرتے رہنا
گردش وقت نے سکھایا ہے
تند موجوں سے کھیلتے رہنا
ایک دن تو بکھرنا ہے احسنؔ
خود کو کب تک سمیٹتے رہنا

شاعری

غزلیں

مسلم نواز

دل کی جو بات تھی وہ میرے ذہن سے نکلی
جس طرح باد صبا صحنِ چمن سے نکلی

جسم کا سارا علاقہ میرا بے جان ہوا
وقتِ آخر جو مری روح بدن سے نکلی

صبح کی تازہ ہواؤں نے جو آنکھیں کھولیں
خوشبوئے وصل مرے تن کے شکن سے نکلی

اپنے اسلاف کی تہذیب بچانے کے لیے
ایک خاموش وصیت سی کفن سے نکلی

اک نظر ان کو جو دیکھا تو یہ احساس ہوا
اب طبیعت مری برسوں کی گھٹن سے نکلی

کر گئی ایسے معطر مرے احساس کو وہ
بوئے اخلاص جو محبوب کے تن سے نکلی

گر پڑا خوف سے سجدے میں اسی دم مسلم
گھن گرج کی جو صدا دور گگن سے نکلی

ناصر شاہی برہانپوری

سبز، سنہری، نیلی، پیلی، دھانی، اودی روشنیاں
رنگ بدلتی دنیا میں ہیں رنگ بدلتی روشنیاں

بند دریچوں سے یہ نکل کر باہر آہی جاتی ہیں
قید رہیں گی آخر کب تک گھر میں گھر کی روشنیاں

ماضی میں تھا گہرا رشتہ سچائی سے لوگوں کا
اب تک چہروں پر ملتی ہیں آتی جاتی روشنیاں

یہ کیسی تہذیب گھروں میں گھور اندھیرے چھائے ہیں
بازاروں میں چاروں طرف ہیں روشنیاں ہی روشنیاں

تیرا لہجہ کڑوے کسیلے جیون میں امرت جیسا
تیری باتیں تاریکی میں جھل مِل کرتی روشنیاں

پیار، خلوص، ایثار و محبت اس دنیا میں ایسے ہیں
جیسے سلگتی تنہائی میں ٹھنڈی ٹھنڈی روشنیاں

اپنے اپنے خول میں ناصر قید ہیں سب دنیا والے
اپنے اپنے سب کے اندھیرے اپنی اپنی روشنیاں

شاعری

غزلیں

اختر شاہجہاں پوری

ہم اپنے جسم پہ جو بھی لبادہ رکھتے ہیں
تو اس کی فکرِ رفو بھی زیادہ رکھتے ہیں
سخن کی فکر میں پیشِ نگاہ ہم اکثر
تمھارا چہرہ پئے استفادہ رکھتے ہیں
غریب شہر کے بیٹے سہی مگر پھر بھی
غرور و تمکنت شاہزادہ رکھتے ہیں
فضا خلاف مگر منزلوں کے شیدائی
جنوں بخیر سفر کا ارادہ رکھتے ہیں
جو چاہے پیار محبت خلوص لکھ جائے
کتابِ دل کے ہم اوراق سادہ رکھتے ہیں
ہمارے سامنے نقشِ قدم کسی کا نہیں
الگ ہر ایک سے ہم اپنا جادہ رکھتے ہیں
غموں کے خار ہوں یا وہ خوشی کے پھول اختر
سبھی کے واسطے دامن کشادہ رکھتے ہیں

زمین سے نہ کبھی تھا نہ آسمان سے تھا
ہمارا رشتہ تو اونچی سی اک اڑان سے تھا
نہ جانے کتنے سفینے کنارے جا پہنچے
ہوا کو بیر ہمارے ہی بادبان سے تھا
کہاں سے کڑوے کسیلے حروف لے آئے
مری زباں کا تعلق تو زعفراں سے تھا
پلک جھپکتے جہانوں کی سیر کر آیا
پرندہ وہ تو ہمارے اِس جہان سے تھا
وہ امتحان پہ بس امتحان لیتا رہا
اسے یقین سے مطلب نہ کچھ گمان سے تھا
وہاں تو زہرہ جمالوں کی بھیڑ تھی لیکن
مرا تعلق خاطر تو میز بان سے تھا
وہ جس کو سن کے سبھی اشک بار تھے اختر
وہ اقتباس ہماری ہی داستان سے تھا

شاعری

غزلیں

احمد نثار

گھر کے دیوار و در میں زندہ ہیں
ہم تو اپنی نظر میں زندہ ہیں

پر خطر رہگذر میں زندہ ہیں
زندگی کے سفر میں زندہ ہیں

ایک بجھتے ہوئے چراغ کے گرد
کتنے پروانے گھر میں زندہ ہیں

مجھ کو تم مل گئے حیات ملی
ہم ندی کے بھنور میں زندہ ہیں

بوجھ سے اب ہے آدمی بوجھل
رونقیں تو شجر میں زندہ ہیں

موت اب مجھ کو آنہیں سکتی
ہم تو ہر دم خبر میں زندہ ہیں

تھم گئی ہے لہو کی گردش بھی
خواب کس کی نظر میں زندہ ہیں

کس کا ماتم ہے سرحدوں پہ نثارؔ
سب اُدھر کے اِدھر میں زندہ ہیں

خوش حالی کے گیت وہ گانے والی تھی
آنگن میں اک بیل خزانے والی تھی

آنسو اور جذبات چھپانے والی تھی
وہ جب مجھ کو چھوڑ کے جانے والی تھی

اس کا بھی ہر کام قناعت والا تھا
جس کے اندر بھوک زمانے والی تھی

چلنے کی رفتار ہی کم کر دیتے تھے
جب بھی ہم کو میل تھکانے والی تھی

میں کب اس کی موج میں بہنے والا تھا
وہ تو مجھ پر دھاک جمانے والی تھی

مجھ کو ٹھوکر میں رکھنا ٹھیک لگا
دنیا تو قدموں میں آنے والی تھی

میں خواتوں کی شاخ ہلانے والا تھا
تو آنکھوں میں خواب سجانے والی تھی

شاعری

نظم وغزل

مقصود احمد انصاری

''درد کا رشتہ''

زندگی کا
پرتَو
میری ''تہذیب''
ہے
روحِ احساس
تجھ سے
قریب
دِل کے پردے پر
حکومت کرتے ہیں
تیری
یاد کے سائے
آ بھی جا
''درد کا رشتہ''
جاگ رہا ہے
قہقہوں کا شہر
منتظر ہے
تیرا
بَن نہ جائے
یہ کہیں
اب
ہچکیوں کی
نگری

حنیف ساحل

اس سے وابستگی میں کچھ تو ہے
یعنی اس بندگی میں کچھ تو ہے

کچھ طبیعت بھی تھی فقیرانہ
یعنی آوارگی میں کچھ تو ہے

دل جلانے سے بھی ضیا نہ ہوئی
ہجر کی تیرگی میں کچھ تو ہے

قربتوں میں بھی فرقتیں دیکھیں
ان کی موجودگی میں کچھ تو ہے

آشناؤں سے ناشناس رہا
ایسی بیگانگی میں کچھ تو ہے

لوٹ کر آئے گا سمندر بھی
شدت تشنگی میں کچھ تو ہے

خاک اُڑانے میں لذتیں پائیں
دشت سی زندگی میں کچھ تو ہے

(مراسلہ نگار کے خیالات سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

جو وہ لکھیں گے جواب میں

کرم فرما بندہ ــــــــ سلام ورحمت!

شکر گزار ہوں اور احسان مند بھی کہ آپ نے مجھ نا چیز کے مضمون کو اپنے گراں قدر جریدے کی زینت بنایا۔ فون پر آپ سے بات چیت کر کے مزید خوشی کا احساس ہوا۔ آپ کی حوصلہ افزائی نے مجھے مزید تحقیقی مضامین لکھنے اور بھیجنے کی ترغیب عطا کی۔ ایک مضمون ''مدھیہ پردیش میں شاعری ولی سے پہلے'' ای میل'' سے ارسال کیا ہے طوالت کی بنا پر آپ کے موقر جریدے پر شاید شائع نہیں ہو پائے گا۔ اسی مضمون کو مختصر کر کے پیش خدمت کر رہا ہوں۔ مدھیہ پردیش میں اردو شاعری کی قدامت سے متعلق چند اور مضمون ہیں۔ نہایت ادب و احترام کے ساتھ درخواست ہے کہ اپنے موقر جریدے میں شامل فرما کر ممنون فرمائیں۔ مدھیہ پردیش میں اردو کی جڑیں بہت قدیم ہیں بلکہ یہ کہا جائے کہ اردو شاعری کی ابتدا اسی صوبے سے ہوئی مگر مورخین کی یا تو نظر نہیں پڑی یا نظر انداز کر دیا۔ مدھیہ پردیش کی ادبی خدمات کو روشنی میں لانے کی میری کوشش میں میرا تعاون ضرور فرمائیں۔ اس تحقیق پر کسی کو اعتراض ہو تو تردید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

کوثر صدیقی۔ بھوپال

محترم بیگ احساس صاحب ــــــــ السلام علیکم!

سب رس ماہ اکتوبر کا شمارہ آپ کے اداریئے اور راجکماری صاحبہ کی خودنوشت کے سبب کافی متمول ہو گیا ہے۔ آپ نے نظام جمہوریت کے متعلق جن خدشات کا اظہار کیا ہے۔ جمہوریت کی ڈکٹیٹر شپ یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام جمہوریت کسی اخلاقی نظم وضبط کا قائل نہیں ہے۔ اکثریتی طبقہ کی خواہشات نفسی کی تکمیل ہی اس کا مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج متخرب ذہن افراد معزز و معتبر خیال کیے جاتے ہیں۔ نیک دل اور با اخلاق انسانوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ مصنوعی ذہانت، مصنوعی صداقت اور مصنوعی عدل و انصاف کے سینکڑوں مظاہر ادب وفن کی صورت ادب اور معاشرہ میں رائج ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک Feminism کا تصور بھی ہے۔ جس پر راجکماری صاحبہ نے ''آپ بیتی'' کے آخری پیراگراف میں محاسبہ قایم کیا ہے۔ آج کل میں دیکھ رہی ہوں کہ عورتیں اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھ رہی ہیں۔ وہ ایسے ملک میں پیدا ہوئی ہیں جہاں شرم وحیا عورت کا زیور دھرم ہے۔ اب وہ لکھ رہی ہیں۔ قلم ہاتھ میں آیا ہے تو بلولٹریچر نہ صرف لکھ رہی ہیں بلکہ اسے بڑھاوا بھی دے رہی ہیں اور اسے Feminism سمجھ رہی ہیں۔

ڈاکٹر محمود شیخ۔ جبل پور

مکرمی مدیر ماہنامہ 'سب رس'

پروفیسر بیگ احساس صاحب ــــــــ السلام علیکم!

سب رس کا شمارہ تواتر کے ساتھ موصول ہو رہا ہے اس کے لیے آپ واقعی مبارک بادی کے مستحق ہیں۔ ستمبر کا شمارہ زیرِ نظر ہے۔ آپ نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ ''ادھر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اچھے افسانے اور اچھی شاعری کم لکھی جا رہی ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں ہم چاہتے ہوئے بھی شاعری کا حصہ شامل نہ کر سکے۔'' آپ کے یہ دو جملے اُردو زبان کے تخلیق کاروں کو للکارتے بھی ہیں

اور ساتھ ہی اُن سے تخلیقی ثروت مندی کا تقاضا بھی کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے اچانک یہ کیسے فیصلہ کرلیا کہ شاعری اب اتنی پست اور غیر اہم ہو کر رہ گئی ہے کہ اسے شائع کرنا کسرِ شان سمجھا جانے لگا۔ آپ نے اگست ۲۰۱۷ء ہی کے شمارے میں رحمٰن جامی، ستار صدیقی علیم صبا نویدی، اختر کاظمی، جمال قدوسی، مصداق اعظمی، حیدر وارثی، بدر محمدی، رند سرشار کا کلام بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے لیکن ایک مہینے کے بعد ہی آپ کی مختلف رائے سامنے آرہی ہے جس نے سنجیدہ ادب دوستوں اور ادب نوازوں کو ہکا بکا کر کے رکھ دیا۔ آپ کے معروضات پر کھل کر بحث ہونی چاہیے اور اس دور کے ممتاز اور منفرد شعرا کو یہ طلسم توڑنا ہوگا۔ اداریے میں ادبی مباحث کو بھی خاطر خواہ جگہ ملنی چاہیے۔

اگست کے شمارے میں جناب خالد قادری صاحب نے تصوف پر اپنے بلیغ خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ میں نے ان کے مضمون سے خاصا استفادہ کیا اور کچھ نئی باتیں سیکھنے کو ملیں۔ حتیٰ کہ میرا تصوف کے بارے میں وہی ایمان ہے جسے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ''تصوف سرِ زمینِ اسلام پر ایک اجنبی پوادا ہے۔'' بہر حال اس موضوع کو احباب اور اغیار دونوں نے اپنے اپنے نظریاتی اور ذاتی نوعیت کے مادّی مفادات کی تحصیل کے لیے جس طرح استعمال کیا اس سے اس کی رہی سہی ساکھ بھی کمزور ہوگئی۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ **الطاف انجم۔ سری نگر**

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگارنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر' پروفیسر گوپی چند نارنگ' خواجہ حسن ثانی نظامی' مشفق خواجہ' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر' انتظار حسین' پروفیسر شمیم حنفی' فکر تونسوی' پروفیسر نثار احمد فاروقی' ڈاکٹر شہریار' یوسف ناظم' مرزا ظفر الحسن' پروفیسر یوسف سرمست' رفعت سروش' پروفیسر بیگ احساس' دلیپ سنگھ' نریندر لوتھر' علی باقر' کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو 'جیسا دیکھا جیسا پایا' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ' محمد علی صدیقی' علی باقر' عارف حسینی' بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور' شمس الرحمٰن فاروقی' صدیق الرحمٰن قدوائی' ڈاکٹر قمر رئیس' جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی' پروفیسر مغنی تبسم' ڈاکٹر عتیق اللہ' ڈاکٹر مصطفیٰ کمال' رضیہ فصیح احمد' مصحف اقبال توصیفی' ڈاکٹر اشفاق احمد ورک' علی ظہیر' حسن چشتی' ڈاکٹر افسر کاظمی' زاہد علی خاں' من موہن تلخ' انور سدید' مخمور سعیدی' ڈاکٹر مظفر حنفی' علیم صبا نویدی' قمر علی عباسی' مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی' کمار پاشی' رشید انصاری' حامد اکمل' طاہر مسعود' فیروز عالم' حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ' کوچہ پنڈت' لال کنواں' دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی جدید نظم کے بنیادگزاروں میں نمایاں نام: پروفیسر گوپی چند نارنگ

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'اسمٰعیل میرٹھی' صد سالہ سمینار کا انعقاد

اسمٰعیل میرٹھی کا زمانہ نگاہ میں رکھیں تو تعجب ہوگا کہ اردو نظم کی ابتدا کیسے ہوئی۔ دراصل وہ جدید اردو نظم کے بنیادگزاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مزید کہا کہ آزاد اور حالی نے جدید نظم کے لیے زیادہ تر مثنوی اور مسدس کے فارم کو برتا تھا۔ اسمٰعیل نے ان کے علاوہ مثلث، مربع مخمس اور مثمن سے بھی کام لیا— انھوں نے بے قافیہ نظمیں بھی لکھی ہیں (چڑیا کے بچے) اور ایسی نظمیں بھی جن میں مروجہ بحروں کے اوزان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے مصرع ترتیب دیے گئے ہیں (تاروں بھری رات) بعد میں حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعروں اور ترقی پسند شاعروں نے آزاد نظم اور نظم معریٰ کے جو تجربے کیے، ان سے بہت پہلے عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی اور نادر کاکوروی اور اُن سے بھی بہت پہلے اسمٰعیل میرٹھی ان راہوں سے کانٹے نکال چکے تھے۔ پروفیسر نارنگ ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام ایک سمینار میں صدارت کررہے تھے جس کا انعقاد اسمٰعیل میرٹھی کے انتقال کے سو برس مکمل ہونے پر کیا گیا تھا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے آگے کہا کہ بچوں کی کتابیں اسمٰعیل میرٹھی جیسی کسی نے نہیں لکھی اور وہ بچوں کے ادیب کی حیثیت سے مشہور ہوگئے جبکہ انھوں نے دیگر موضوعات پر بھی بے شمار نظمیں کہی ہیں۔ اس سے قبل اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے تمام مہمانوں کا تعارف کرایا اور اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری اور شخصیت پر مختصر روشنی ڈالی۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ اسمٰعیل میرٹھی ایسے شاعروں میں ہیں جنھوں نے اردو نظم کو نیا چہرہ، نیا لباس اور نئی فکر عطا کی۔ ساہتیہ اکادمی نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اُن پر اس سمینار کا انعقاد کیا ہے۔ اس سے پہلے اسمٰعیل میرٹھی پر ایک مونوگراف بھی اکادمی شائع کرچکی ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز دانشور اور تنقید نگار حقانی القاسمی نے اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری اور اُن کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ایسے شاعر واقع ہوئے ہیں جنھوں نے مکمل طور پر روایت سے انحراف کرکے اردو نظم میں فکر، ہیئت اور لفظیات کی سطح پر نئی راہیں نکالی، نئے تجربات کیے اور نئی نسل کے لیے ایک نئی راہ اس میدان میں ہموار کیے۔

سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شافع قدوائی نے کی۔ اس اجلاس میں نند کشور وکرم نے 'بچوں کے شاعر: اسمٰعیل میرٹھی'، ف س اعجاز نے 'ادب میں اسمٰعیل میرٹھی کا مقام' اور ریاض احمد نے 'اردو کی ابتدائی درسیات اور اسمٰعیل میرٹھی' کے عنوانات سے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ پچھلی نسلوں نے پڑھنا لکھنا اسمٰعیل میرٹھی سے سیکھا۔ وہ پہلے ادیب تھے جنھوں نے قواعد کی جانب اور تخلیقی زبان کو کیسے پڑھا جائے اس جانب توجہ دی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم نے کی جبکہ فاروق ارگلی، جمیل اختر اور دانش الٰہ آبادی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس سمینار کے دوران یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ اسمٰعیل میرٹھی کو اردو ادب کی تاریخ میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ نئی نسل نے سوال اٹھایا کہ آج اردو دنیا اسمٰعیل میرٹھی کو کیوں فراموش کرچکی ہے۔ سمینار میں دہلی واطراف کے اردو زبان وادب سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ کثیر تعداد میں ریسرچ اسکالرز موجود تھے۔ سمینار کی کامیابی کے لیے سبھی نے محمد موسیٰ رضا اور ساہتیہ اکادمی کے دیگر کارکنان کو مبارکباد پیش کی۔

جناب مہتاب قدر

General Secretary, Gulf Urdu Council

President Urdu Gulbun, Jeddah

جناب مجتبیٰ حسین

11-5-152, Flat No. B-107, Royal Orchid, Red Hills, Hyderabad - 500 004

جناب اسیم کاویانی

Flat No. 702, Ketan Apartments

Belvedre Road, Mazgaon MUMBAI - 400 010

ڈاکٹر وسیم بیگم

Associate Professor, Dept of Urdu

MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500 032.

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی

Associate Professor, Dept of Persian

MANUU, Gachibowli, Hyderabad - 500 032.

جناب اشتیاق سعید

B-01, Mira Paradise CHS., Geeta Nagar Phase-II,

Balaji Chowk, Mira Road-401107 (Thane)

جناب کوثر صدیقی

Editor "Karwan-e-Adab", Zeb Villa, # 79-A,

Ginnori Road, Bhopal - 462 001

پروفیسر سید احسن رضوی

B-1/4, Balda Road Colony, Nishatganj,

Lucknow - 226 007

جناب مسلم نواز

12-3-H/1, Patwar Bagan Lane,

Kolkata - 700 009

جناب ناصر شاہی برہانپوری

10, Shanwara, Burhanpur (M.P.) 450 331

جناب اختر شاہجہانپوری

Rangeen Chaupal, Shahjahanpur 242 001

ڈاکٹر ایم۔اے۔انصاری (ایڈوکیٹ)

Calcutta High Court, Circuit Bench at Port Blair

Central Administrative Tribunal Calcutta

Distict & Session's Court, Port Blair (Andaman)

Bihar - 851 128

جناب حنیف ساحل

14, Ashaiana Park, Mahemdabad - 387 130,

Dist: Kheda, Gujarat

جناب احمد نثار

Dhanbad, Jharkhand

جناب علی نثار (کینیڈا)

A group photo at King Kothi Nizam-VII, Pandit Nehru, Mrs. Vijay Laxmi Pandit

کنگ کوٹھی میں ایک یادگار تصویر میر عثمان علی خاں۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مسز وجے لکشمی پنڈت اور دیگر

Regd No. H-HD 970-2015-2017 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-11 November, 2017 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

سیاست

حیدرآبادی دور،
ثقافت اور طرز زندگی کا
مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے موقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے بیرونی ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطی، یو کے، یو ایس اے اور کینیڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

... اردو والے حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، واقعات اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائٹ ہے جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کرکے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (A.P) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469